مشمولات

جام نور اسلامی حدود کے اندر آزادی اظہار کا حامی ہے- اہل قلم کی آرا سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مبلغ اسلام مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی

ولادت: ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء—وفات: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء

کی دینی، تحریکی اور تبلیغی خدمات کے نام

- جن کی شخصیت پر مبلغ اسلام، ماہرِ سنت السنہ، سفیر اسلام اور سیاح عالم جیسے القاب صحیح طور پر چسپاں ہوتے ہیں-
- جنہوں نے عصر جدید میں سب سے پہلے اسلام کی عالمی تبلیغ واشاعت کا تاریخی فریضہ جدید تقاضوں کے مطابق انجام دیا-
- جنہوں نے ۱۹۴۹ء میں ''تنظیم بین المذاہب'' قائم فرمائی جو کمیونزم اور لادینیت کے خلاف پہلی باضابطہ بین مذاہبی کوشش تھی-
- جنہوں نے اسلام کی دعوت کے لیے مختلف زبانوں میں اسلام پر متعدد کتابیں لکھیں اور کئی ایک رسائل وجرائد کا اجرا فرمایا-

اور

- جن کی موثر دعوت اسلام جارج برناڈ شا تک پہنچی اور انہوں نے قادیانیت سمیت تمام مخالف اسلام تحریکات کا عالمی تعاقب کیا-

ادارہ جام نور

مبلغ اسلام ایک نظر میں

نام: محمد عبدالعلیم صدیقی
لقب: مبلغ اسلام، ماہر ہفت السنہ، سفیر اسلام، سیاح عالم
حسب ونسب: آپ نجیب الطرفین صدیقی تھے- چنانچہ آپ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے ۳۶ ویں پشت میں حضرت محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک اور والدہ کی طرف سے ۳۲ ویں پشت میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے-
والد گرامی: مفتی عبدالحکیم جوشؔ صدیقی قادری
ولادت: ۱۵/ رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق ۳/ اپریل ۱۸۹۳ء بروز پیر
تعلیم وتربیت: آپ نے اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور صرف سات سال کی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کرلیا- بعد ازاں، مدرسۂ عربیہ اسلامیہ، میرٹھ، میں داخل ہوئے- والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھا، تو بقیہ تعلیم وتربیت آپ کی والدۂ ماجدہ اور برادرِ اکبر مولانا احمد مختار صدیقی نے کی-
اعلیٰ تعلیم اور فراغت: اس کے بعد مدرسۂ عربیہ میرٹھ سے ۱۳۲۶ھ میں درسِ نظامی کی سند حاصل کی- اس کے بعد بی اے کیا اور پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی- پھر میرٹھ کے حکیم احتشام الدین سے علمِ طب سیکھا-
اساتذہ: مفتی عبدالحکیم جوشؔ صدیقی، مولانا احمد مختار صدیقی، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی-
اجازت حدیث: اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے آپ کو ۱۹/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صحاحِ ستہ وغیرہا کتبِ احادیث کے روایت کرنے کی سندِ اجازت عطا فرمائی-
بیعت واجازت: آپ اپنے برادرِ اکبر مولانا احمد مختار صدیقی کے مرید وخلیفہ تھے، اپنے مرشد کے علاوہ آپ کو شیخ المشائخ حضرت سیّد شاہ محمد علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی ''اشرفی میاں'' اور اعلیٰ حضرت سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی-
زبانوں پر عبور: اردو، انڈونیشی، انگریزی، جاپانی، جرمن، چینی، ڈچ، سواحلی (افریقی)، عربی، فارسی، فرانسیسی، ملائی، ہندی وغیرہ پر عبور تھا-
تلامذہ: دنیا کے مختلف حصوں میں اُن کے لاتعداد شاگرد ہیں، جن میں صرف ماریشش میں ان کے دس ہزار شاگرد ہیں- چند مخصوص تلامذہ یہ ہیں: علامہ شاہ احمد نورانی، مولانا فضل الرحمٰن انصاری، ڈاکٹر ایچ ایس منشی، مدیر دی جینوئن اسلام، سنگاپور، سیمجی گن یونیورسٹی کے ماہر تعلیم مسٹر عبدالباسط، شرقی ریاستہائے متحدہ کے مفتیٔ اعظم حضرت عبدالرحمٰن، جانشین قطب مدینہ مولانا فضل الرحمٰن مدنی-
مریدین وخلفا: آپ کے مختلف ممالک میں لاتعداد مریدین ومتوسلین تھے، لیکن سوانح نگاروں نے صرف تین خلفا کا ذکر کیا ہے: مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی (صاحبزادے) ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (داماد)، مفتی محمد فضل الرحمٰن رحمانی-
غیر مسلموں کا قبول اسلام: تبلیغ اسلام کے نتیجے میں آپ نے تقریباً ایک لاکھ سے زائد عیسائیوں، ملحدوں، ہندوؤں اور کافروں کو مسلمان کیا-
تعمیری وتحریکی خدمات: آپ نے بے شمار ملکوں میں، متعدد مساجد، لائبریریز، تعلیمی، تبلیغی ادارے قائم فرمائے، ہسپتال اور یتیم خانے بنوائے اور کئی تنظیمیں بھی تشکیل دیں، مثلاً کمیونزم اور لادینیت کے خلاف سنگاپور میں، ۱۹۴۹ء میں ''تنظیم بین المذاہب'' قائم فرمائی-
رسائل کا اجرا: آپ نے ۱۹۳۱ء میں سنگاپور سے ''رئیل اسلام''، سنگاپور ہی سے ۱۹۳۶ء میں ''دی جینوئن اسلام'' وغیرہ جاری کیے-
تحریک پاکستان میں حصہ: تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، جس کے اعتراف میں قائد اعظم نے آپ کو ''گشتی سفیرِ پاکستان'' کا خطاب دیا-
مخصوص تصانیف: لطائف المعارف، مرزائی حقیقت کا اظہار، المراۃ القادیانیہ (عربی)، How to Preach Islam; The Mirror; وغیرہ-
وصال: ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲/ اگست ۱۹۵۴ء کو مدینۂ منورہ میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی-

اداریہ **خوشتر نورانی**

امام حرم کے پیچھے نماز کے لیے اشتہار: سنت یا بدعت؟

۲/۳/ مارچ ۲۰۱۲ء کو علمائے اہل حدیث کی طرف سے دہلی میں رام لیلا میدان میں ''عدالۃ الصحابہ کانفرنس'' منعقد ہوئی- صحابہ کی عظمت پر کہاں حملے ہورہے ہیں، جس کے دفاع کے لیے علمائے اہل حدیث کمر بستہ ہیں؟ یہ فرائض کن اشاروں پر، کن مقاصد کے لیے انجام دیے جا رہے ہیں، یہ تو بہتر وہی جانتے ہیں، ہمیں ان سے شکوہ کیا، سوائے اس کے کہ ہم بشمول ان کے معاصر تمام مسالک سے یہی امید رکھتے ہیں کہ دین اور مسلک کی اشاعت کے نام پر اگر شیرازۂ امت بکھر رہا ہو اور مسلمانوں کی اجتماعیت ٹوٹ رہی ہو تو ایسے موقعے پر ہر شخص اور ہر جماعت کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے- ''عدالۃ الصحابہ کانفرنس'' کے ایک مہینے پہلے سے اشتہارات اخبارات میں چھپ رہے تھے اور پوری دہلی میں جگہ جگہ بڑے بڑے پوسٹرس، بینرز اور ہورڈنگز آویزاں تھے- خاص بات یہ کہ ان اشتہارات میں امام کعبہ شیخ سعود بن ابراہیم الشریم کی آمد کی خبر اور ان کے پیچھے رام لیلا میدان میں نماز کی دعوت زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی تھی- اشتہارات میں یہ بات بھی لکھی گئی تھی کہ لوگ اپنے ساتھ مصلے لے کر آئیں- ابھی کچھ مہینوں پہلے امام کعبہ شیخ محمد السدیس کی آمد پر بھی اسی طرح کی ہنگامہ آرائی کی گئی تھی- ایک عام مسلمان مذہب کے نام پر ہونے والے اس پروپیگنڈے سے مرعوب ہو جاتا ہے- وہ اپنے کاروبار کو چھوڑ کر امام حرم کے پیچھے نماز کے لیے ایسے بھاگتا ہے جیسے رام لیلا میدان میں آسمان سے کوئی فرشتہ اتر پڑا ہو اور اس کے پیچھے نماز پڑھ کر اپنے لیے جنت کے ٹکٹ کی بکنگ کرانی ہو یا جیسے امام کعبہ نہیں آئے رام لیلا میدان میں کعبہ اتر آیا ہو، جب کہ اہل علم اس تماشے پر حیران و پریشان ہیں کہ یہ علمائے اہل حدیث، جنھوں نے ہمیشہ بدعت کے خلاف، حسنہ اور سیئہ کی تفریق کے بغیر جنگ لڑی ہے، یہ کون سی بدعت وضع کر لی ہے؟ اس ہنگامہ آرائی کا سوائے اس کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ علمائے اہل حدیث نے اپنی عددی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانفرنس کی کامیابی کے لیے امام حرم کے پیچھے نماز کے نام پر عوام کی بھیڑ جمع کرنے کی خوب صورت تدبیر نکال رکھی ہے- مذہب اور دین کے نام پر فقیہان حرم نے عوام کے جذبات سے پہلے بھی کھیلا ہے، یہ کوئی نیا سانحہ نہیں ہے، اگر اس میں کچھ نیا ہے تو واقعے کی نوعیت نئی ہے جو کئی سوالات جنم دیتی ہے، مثلاً:

۱- اجتماعی نماز کے تین بڑے مواقع جمعہ اور عیدین کے علاوہ اس چوتھے موقعے کہ جس میں امام کعبہ جہاں کہیں جائیں، ان کے پیچھے نماز کے لیے دعوت عام دی جائے، کیا اس کی کوئی نظیر کتاب و سنت اور تاریخ اسلام میں موجود ہے؟

۲- حرمین شریفین میں نماز کے ثواب بڑھ جانے کی بات احادیث سے ثابت ہے، کیا کوئی ایسی حدیث بھی ہے جس میں ایسی کوئی بشارت ہو کہ اگر امام حرم کے پیچھے حرم کے باہر بھی نماز پڑھی جائے تو ثواب میں اضافہ ہوگا؟

۳- حدیث شد رحال جس میں اس بات کا حکم ہے کہ صرف تین مسجدوں کا سفر کیا جا سکتا ہے، مسجد حرم، مسجد نبوی اور مسجد القدس، شیخ ابن تیمیہ اور ان کے ہم نواؤں، جن میں علمائے اہل حدیث بھی شامل ہیں، نے اس حدیث سے اس مسئلے کا بھی استنباط کیا ہے کہ حتی کہ روضۂ رسول ﷺ کی زیارت کے مقصد سے سفر کرنا بھی حرام ہے- ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کیا کوئی ایسی حدیث بھی ہے جس سے صراحت یا اشارے سے یہ بات ثابت ہو کہ رام لیلا میدان میں اگر امام حرم نماز پڑھائیں تو کثرت ثواب کی نیت کے ساتھ رام لیلا میدان کا سفر کرنا سنت، مستحب یا جائز ہو؟

۴- بدعت اور سنت کا معیار کیا ہے؟ علمائے اہل حدیث نے کانفرنس کی کامیابی کے لیے عوامی جذبات کا استحصال کر کے بھیڑ اکٹھی کرنے کا جو خوب صورت طریقہ اپنایا ہے، یہ اس معیار کے مطابق سنت ہے یا بدعت؟ ہمیں اس حوالے سے ہر طبقے کے علما، طلبہ، اہل علم و دانش اور عام قارئین کی آراء کا انتظار رہے گا- □□□

قارئین سے معذرت: ماہ نامہ جام نور کے پوسٹنگ لائسنس کی ہر تین سال پر تجدید ہوتی ہے، اس بار بعض دفتری اسباب کے پیش نظر تجدید میں تاخیر ہوگئی جس کی وجہ سے جام نور تین مہینے کی تاخیر سے پوسٹ کیا جا رہا ہے- فروری کے شمارے کے ساتھ مارچ، اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ بھی پوسٹ کیا جا رہا ہے- اس تاخیر کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں- ان شاء اللہ آئندہ جام نور حسب سابق قارئین تک پہنچتا رہے گا- (ادارہ)

منظرالاسلام ازہری☆

دین میں تشدد کا انجام

یورپ کے عہد تنویر کا ایک منظر جو موجودہ مسلم دنیا کے لیے درس عبرت

اٹھارویں صدی کا یورپ عہد تنویر اور روشن خیالی کے عہد کے طور پر جانا جاتا ہے- چرچوں کی دقیانوسیت ، پادریوں کی قلا بازیاں ، دینی شخصیتوں کی آپسی محاذ آرائیوں اور سائنسدانوں اور فلسفیوں کی چیخ و پکار کے بعد اٹھارہویں صدی میں جو یورپ سامنے آیا اسے عہد نور The Age of Enlightenment سے تعبیر کیا جاتا ہے- سائنس اس عہد میں اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی اور فلسفہ اپنی قدیم بنیادوں پر عہد نو کی جدید تشریحات پیش کر رہا تھا اور اخلاق و کردار کے اصول مذہب کے بجائے عقل کی روشنی میں طے کیے جا رہے تھے- سترہویں صدی جو اٹھارہویں صدی کے عقلی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، میں یورپ میں Bruch Spinoza(1632-1677) John Locke (1632-1704) Issac Newton (1643-1727) Jean Jacques Rousseau (1712-1778) Gottfried Wilhelm Leibniz (1646-1716) اور Voltaire (1694-1778) جیسے قدآور فلسفی اور عہد نور کے بانی کی حیثیت سے مشہور ہوئے- ان فلسفیوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کائنات کی تشریح کی- Leibniz اور Voltaire دو حریف فلسفی کی حیثیت سے سامنے آئے- اول الذکر عقلیات سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ خدا کی قدرت پر پوری طرح ایمان رکھتا ہے اور اور قدیم روایتوں کا احترام بھی کرتا ہے جبکہ Voltaire خدا کی قدرت پر ایمان رکھنے کے ساتھ اس سے شکوہ کناں بھی ہے- حوادث زمانہ سے پوری طرح متاثر ہوا ، اسباب و علل کی معرفت پر اپنی زندگی صرف کر دی اور عیسائیت پر پورح طرح قدغن لگایا- میں اپنے اس مضمون میں Voltaire کا فلسفۂ دین بیان کروں گا اور اس کے ساتھ Leibniz کے فلسفہ کا جو اس نے مذاق اڑایا ہے اس کا بھی ذکر کروں گا-

Voltaire(1694-1778) اپنے عہد کا بڑا فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ معروف تاریخ نگار، شاعر اور ادیب بھی ہے- فرانسیسی زبان میں اس کی شاعری اور اس کے ڈرامے اس کی فکری بلندیوں کی حسین شاہ کار ہیں- اٹھارہویں صدی کا شاید ہی کوئی ایسا متنازع قضیہ ہوگا جہاں وولٹیر اپنا ٹانگ اڑاتا ہوا نظر نہیں آتا ہے- وہ اپنی نظموں میں کبھی حکومت وقت کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، کبھی پادریوں کی ظلم و زیادتی کا تذکرہ کرتا ہے، کبھی چرچوں کی بے راہ روی سے شکوہ کناں ہے، کبھی راہبوں کی رہبانیت اس کا موضوع بحث بنتی ہے اور کبھی عیسائی پیشوا جو خود ہی خدا بن بیٹھے تھے، سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے- یہ ساری باتیں اس نے بڑے حسین انداز میں کی ہیں- اس کا انداز بیان عام فلسفی روش سے ہٹ کر تمسخر اور استہزا کا ہے- اس کے فلسفے کی بنیاد خالص عقلی ہے اور اس کے تین اہم اصول ہیں: (۱) انسانی خود مختاری یعنی انسان اپنے ارادہ و اختیار میں مجبور نہیں- (۲) شک: حقیقت تک پہنچنے کے لیے شک کا راستہ اپنانا ضروری ہے- (۳) باہمی عدل و انصاف کا عالمی تصور-

Voltaire کی تحریر بتاتی ہے کہ وہ خدا کا کبھی منکر تو نہیں رہا مگر اپنے خاص نظریہ Pessimism (قنوطیت) کا حامی تھا-

خدا کو خالق کی حیثیت سے وہ تسلیم بھی کرتا ہے- تاہم عیسائیوں کے نظریہ خدا کا وہ سختی سے مخالف ہے- وہ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ ایک مثالی اخلاق کا حامی انسان مانتا ہے- پادریوں کے تشدد آمیز رویوں پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ ”حضرت مسیح نے تو کبھی کسی شخص کو اس بنیاد پر آگ میں نہیں ڈالا کہ وہ ان کے دین کا پیروکار نہیں تھا“- اس کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کو اس طور پر مانا جائے کہ اس نے انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ترغیب دی ہے- وہ اس حد تک دیگر ادیان کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ ان کے مقاصد معاشرہ سے نفرت و بیزاری کو ختم کر کے اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرنا ہے- وہ لکھتا ہے: We need a God who speaks to the human race. ہمیں ایسے خدا کی ضرورت ہے جو انسانی نسل سے ہم کلام ہو-

☆Islamic Association of Carry,North Carolina,USA-email:manz786@gmail.com°

خدا کے وجود کا انکار کرنے والوں کی اس نے تردید بھی کی ہے- لادینیت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھ کر خدشہ کا اظہار کیا اور کہا کہ الحادی ذہنیت اگر اسی طرح فروغ پاتی رہی تو معاشرہ تباہ و برباد ہوکر رہ جائے گا - پھر زور دار انداز میں لکھتا ہے: If God did not exist it would be necessary to invent him. اگر خدا موجود نہیں تو اسے وجود میں لانا ہمارا فریضہ ہے- اس کا ماننا ہے کہ عقل میں اس قدر صلاحیت ہے کہ وہ خدا کے وجود کا بخوبی اعتراف کر سکے- خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے کسی وحی اور الہامی کتاب کی کوئی ضرورت نہیں-

ابتدا میں optimissim (دنیا میں کوئی چیز بری نہیں، ہر چیز سے اچھی امید رکھنی چاہئے) کی حیثیت سے مشہور ہوا- اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ اگر ہر چیز اپنے اندازہ کے مطابق چلتی رہی تو دنیا میں مفید چیزوں کی تعداد نقصان دہ چیزوں سے کہیں زیادہ ہیں- ایک اور مکتوب میں لکھتا ہے: انسان میں فطری طور پر برابری کے جذبات موجزن ہیں اور دوسروں کے بارے میں اس کے خیال بھی فطری طور پر اچھے ہیں- مگر جب Lisbon میں بھیانک زلزلہ آیا جس میں Voltaire کے مطابق ہزاروں لاکھوں افراد موت کے آغوش میں چلے گئے - بچے، جوان، عورت، مرد، اور بوڑھوں کی لاشیں سڑکوں پر ہر طرف نظر آنے لگیں- جو گرجا گھر اپنی عبادتوں میں مصروف تھے وہ اسی حال میں ہلاک ہوگئے - اس حادثے نے اس کے دل پر بڑا گہرا اثر ڈالا- پھر جب اس حادثے کی تشریحات عیسائی رہنماؤں نے اس انداز میں شروع کی کہ یہ سب خدا کا عذاب اور ہمارے اعمال کی کارستانیاں ہیں تو وولٹیر نے اپنے خیال پر نظر ثانی کی اور ایک مفصل نظم Tragedy of Lisbon کے عنوان سے لکھی- خلاصہ یہ ہے:

ذرا ان بچوں اور عورتوں کی طرف دیکھو جنہیں زمین نے اچانک پوری طرح آن لیا ہے- ان کی بوٹیاں بوٹیاں کر ڈالی ہیں اور انہیں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے- گھر کا چھت گر جانے کی وجہ سے وہ زندہ دفن کر دیے گئے ہیں- کیا تمہیں ان کی ہلکی، سسکتی بلکتی آواز سنائی دے سکتی ہے؟ کیا تمہیں تا حد نگاہ دھواں کا بادل نظر آ رہا ہے؟ ان سب کے باوجود تمہارا خیال ہے کہ یہ سب کچھ قدرت الٰہی کا کرشمہ اور مشیت ایزدی کے خیر مطلق کا اثر ہے؟ کیا تم یہ کہو گے کہ خدائے قادر نے ان سب سے بدلہ لیا ہے اور ان کی موت ان کے جرم کی سزا ہے؟ مگر ان معصوم بچوں کا کیا قصور ہے جنہیں ان کی ماں کی مامتا سے یکلخت دور کر دیا گیا ہے اور ان کی ماؤں کی گود کو ویران کر دیا گیا! لندن اور پیرس میں جو آوارگی ہے کیا وہ Lisbon سے کسی کم درجہ پر ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ Lisbon کو تو تہہ و بالا کر دیا گیا اور پیرس میں رقص عریاں کا ساز باز اسی طرح گرم ہے؟ کیا خدائے علیم و قدیر اس بات پر قادر نہیں کہ ایسی دنیا وجود میں لائے جو ابدی نعمتوں کی سرفرازیوں سے بھرپور اور خیر محض کا گہوارہ ہو؟ ان تمام تباہی و بربادی کے باوجود یہ سمجھنا کہ بعض افراد کی ہلاکت اجتماعی سعادت مندی کا پیش خیمہ ہے! یہ کون سی سعادت مندی ہے؟

اے ناتواں انسان اب بھی تو یہ نغمہ سرا ہے کہ ''ہر چیز اپنے مطابق اچھی ہے؟'' کائنات تمہارے سامنے جھوٹ کا پلندہ پیش کر رہی ہے، تمہارا دل سو مرتبہ تمہارے خیال کی تردید کر رہا ہے- تمام عناصر، انسان اور حیوان دائمی کشمکش میں ہیں- کیوں نہ مان لیا جائے کہ دنیا برائی سے جل تھل ہے- کائنات کا یہ دائمی صراع اور یہ بھیانک ہلاکتیں اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہیں کہ خدائے طاہر و طیب پر ایمان لایا جائے! خدا موجود ضرور ہے مگر یہ ایک حیران کن پہیلی بھی ہے- اس نے مسیح علیہ السلام کو نجات دہندہ بنا کر بھیجا ہے مگر ان کی قربانی کے باوجود انسان اور زمین اپنی اسی پرانی روش پر قائم ہے-

Voltaire نے اپنی نظم کا اختتام قنوطیت کے ساتھ کیا ہے اور یہ اعتراف کیا کہ انسان دنیاوی شر کے سامنے بے بس ہے، اس کے لیے ایمان اور عبادت الٰہی بجالانے کے سوا کچھ بھی نہیں-

یہ وہ حادثات تھے جس نے Voltaire کو اپنے optimissim (دنیا میں کوئی چیز بری نہیں، ہر چیز سے اچھی امید رکھنی چاہئے) نظریہ کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا اور پھر وہ قنوطیت کا قائل ہوگیا-

Voltaire کی اس نظم سے عیسائی مذہبی برادری میں ہنگامہ برپا ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفیوں میں بھی بھونچال پیدا ہوگیا- Jean Jacques Rousseau نے ۱۸؍اگست ۱۷۵۶ء کو Voltaire کو خط لکھا اور اس میں تشریح کی ''انسان جس طرح کے مصائب و آلام میں بھی مبتلا ہوتا ہے وہ انسانی گناہوں کا نتیجہ ہی ہے Lisbon کا زلزلہ عدل و انصاف پر مبنی انسان کے لیے ایک سزا ہے تا کہ انسان اپنی طبعی

زندگی اور شہر میں رہنے کے بارے میں فکر کرے- اگر انسان ادھر ادھر مختلف گاؤں دیہات اور معمولی گھروں میں سکونت اختیار کرے تو ممکن ہے کہ تباہی کا تناسب بھی کم ہو- ہمیں اس بات پر ایمان رکھنا چاہئے کہ خدا خیر کا ہی سبب ہے-

Leibniz اور Voltair کی رزم آرائی: Leibniz (۱۶۴۶-۱۷۱۶) جرمن فلسفی ہے- بڑا ذہین انسان تھا- اپنی ذہانت کی وجہ سے جو کچھ اس نے تعلیم حاصل کی اس میں کسی استاد سے مدد نہیں لی- قانون، فلسفہ، حساب اور دینیات میں مہارت حاصل کی- اس نے بیس سال کی عمر میں علل و اسباب سے متعلق ایک کتاب جرمن زبان میں De Arte Combinatoria کے عنوان سی لکھی- اس کا انگلش ترجمہ On the Art of Combination کے عنوان سے کیا گیا- اس کتاب میں اس نے ذکر کیا ہے کہ All reasoning is reducible to an ordered combination of simple elements. یعنی تمام اسباب ایک مجموعی مرتب عنصر میں سما سکتا ہے- کہتے ہیں کہ اس نے اعداد و شمار سے متعلق ایک مشین بھی ایجاد کیا- عہد حاضر کا کمپیوٹر اسی کے اعداد و شمار کے قواعد کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے- وہ ایک فلسفی اور سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا مذہب پرست تھا- وہ عیسائیوں کے پروٹیسٹن فرقہ سے تعلق رکھتا تھا- اس کا ایمان تھا کہ کائنات کا خالق خدائے پاک ہی ہے- خدا کے وجود اور اس کی قدرت کا تصور Leibniz کو نظام کائنات کے اسباب و رموز کے سمجھنے کی طرف لے گیا اور اس نے نظام کائنات Metaphysics ماوراء طبعیت کے سہارے سمجھنے کی کوشش کی- مذہب اور سائنس میں تطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے- خدا کی پیروی، مخلوق کا ادراک کرنے کے لیے انسان پر ضروری ہے کہ وہ اسباب وعلل پر غور وفکر کرے- Leibniz نے اس بات کو بڑے سنہرے انداز میں بیان کیا ہے- اس کا کہنا ہے کہ متقی ہونے کے لیے انسان کو خدا سے محبت کرنا ضروری ہے- مگر خدا کی محبت اس کی معرفت کے بغیر نہیں ہوسکتی- مذہب اور عقل دو الگ الگ چیزیں نہیں- انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کا منظور نظر بن جائے اور اس کی بنائی ہوئی خوبصورت اور منظّم دنیا کی تعریف کرے- (Theodicy, p: 51) مذہب اور سائنس میں تطبیق دینے کے لیے وہ پوری طرح دیوانہ وار اسباب وعلل میں غور فکر کرتا رہا ہے اور جس عقلی زاویہ سے غور وفکر کیا اس کو اس نے The princple of sufficient reason اطمینان بخش سبب کے قاعدہ کا نام دیا- اس نے نیوٹن کے نظریۂ اضافت پر یہ کہہ کر تنقید بھی کی کہ اس نے اس اضافت کی وجہ ذکر نہیں کی یا اس کی وجہ ذکر کرنے سے قاصر رہا-

Voltaire نے Leibniz کے قاعدہ قابل اطمین بخش کا سختی سے رد کیا اور نیوٹن کی حمایت بھی کی- اس نے مضحکہ خیز انداز میں Leibniz کے رد اور نیوٹن کی حمایت میں اپنی معروف کتاب Candide میں ایک خیالی شہر Eldorado کا نقشہ پیش کیا ہے جو دراصل کتاب کا عنوان ہونے کے ساتھ ساتھ اس ناول کا اہم کردار بھی ہے- Candide کو اپنی زندگی میں مختلف پریشانیوں اور حوادثات کا سامنا ہوتا ہے- ایک موقع پر وہ دریا، پہاڑ، جنگل اور سمندر پار کرکے ایسی آبادی میں پہنچ جاتا ہے جو بڑا امن وامان، پرسکون، نعمتوں سے مالا مال علاقہ ہے- یہاں دنیا کی تمام لذتیں اور تمام نعمتیں موجود ہیں- امیر وغریب کا کوئی فرق بھی نہیں- یہاں عدالتی نظام بھی رائج نہیں ہے- غرض کہ نہایت سلیقہ سے سنوارا گیا یہ شہر دنیا کی جنت سے کسی قدر کم نہیں- اس علاقے کا خوبصورت نقشہ بیان کرنے کے بعد Voltaire اپنے حریف Lebniz پر تنقید کرتا ہے کہ یہ ایسا ملک ہے جہاں بڑے بڑے سائنسداں اور انجینئرز ہیں جنھوں نے اپنے حسن عمل سے اس دنیا کو سجا رکھا ہے جو لوگوں کے لیے مفید ہے- یہاں کوئی مذہبی شخص یا ماوراء طبیعت کا حامل نہیں ہے- کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے Voltaire اس میں بڑی دلیری کے ساتھ Leibniz کے نظریہ اور عام طور پر مذہبی نظریہ پر تنقید کرتا ہے:

اس سفر میں Candide کا ساتھی Cacambo نامی ایک شخص ہے جو اس کا مترجم بھی ہے- Candide اس کے توسط سے Eldorado کے سربراہ مملکت سے پوچھتا ہے:

کیا اس ملک کا کوئی دین بھی ہے؟

سربراہ: آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہمارا ملک کسی مذہب کے بغیر ہے؟ کیا آپ ہمیں کسی غیر متوقع عذاب میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں؟

کنڈیڈ: Eldorado کا مذہب کیا ہے؟

سربراہ: کیا دنیا میں ایک مذہب کے علاوہ بھی کوئی دوسرا مذہب ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے اور دوسروں کے مذہب میں کوئی فرق نہیں-
کنڈیڈ: کیا آپ صرف ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں؟
سربراہ: دو، تین یا چار خدا کو ماننے کی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے- یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تمہارے ملک کے لوگ بڑا عجیب سوال کرتے ہیں!
کنڈیڈ: اچھا آپ کے ملک کے لوگوں کی عبادت کا طریقہ کیا ہے؟
سربراہ: عبادتوں سے ہمارا بالکل کوئی تعلق نہیں کیونکہ ہم کسی چیز کے ضرورتمند ہی نہیں، خدا نے ہمیں ہر طرح کی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے- ہاں، ہم مستقل اس کی کرم نوازیوں کے شکر گذار ضرور رہتے ہیں-
کنڈیڈ: کیا میں پادری سے ملاقات کر سکتا ہوں؟
سربراہ: (ذرا مسکراتے ہوئے) میرے دوست اس ملک میں ہر شخص پادری ہے- ہر صبح بادشاہ کے ساتھ چار سے پانچ ہزار لوگ مذہبی ساز کے ذریعہ شکر خدا بجالاتے ہیں-
کنڈیڈ: (تعجب کے ساتھ) کیا آپ کے ملک میں کوئی حاکم نہیں اور نہ کوئی پادری ہے جو ہر وقت لمبے لمبے لکچر زدیا کرے اور جو اس کے نظریات سے اتفاق نہ کرے اسے دہکتی ہوئی آگ میں جلا کر بھشم کردے!!
سربراہ: اگر ہم ایسا کریں تو پاگل پن سے کم نہیں، ہمارے ملک میں ہر ایک کا ایک ہی عقیدہ ہے، مجھے نہیں معلوم کے تمہارے ہاں کے پادری ایسا کیوں کرتے ہیں؟ (Candide:page:79)

Voltaire کی تحریر کا ایک بڑا حصہ مختلف حکمراں اور فلسفیوں کو لکھے گئے مراسلہ پر مبنی ہے- ان مراسلات میں اس نے اپنے فلسفی نظریہ کی کھل کر وضاحت کی ہے- ایک خط اس نے Roland Des Alleurs کے نام ۲۶ نومبر ۱۷۳۸ء میں لکھا ہے- اس خط میں Leibniz کا نظریہ ماوراء طبیعت پر زبردست تنقید کی ہے- ایک جگہ لکھتا ہے:

An immens abyss in which everyone is blind ماوراء طبیعت ایک اتھاہ سمندر ہے جہاں سب لوگ آنکھ موند کر غرق آب ہوجاتے ہیں-

Voltaire اپنی کتاب Candide میں جگہ جگہ Leibniz کے نظریہ ماوراء طبیعت کا مذاق اڑاتا ہے- ایک جگہ اپنے ایک سمندری سفر کی داستان بیان کی ہے- اس سفر میں اس کا ایک ساتھی طوفان کی وجہ سے ڈوبنے کے قریب ہے- Candide اسے بچانا چاہتا ہے کہ Pangloss جو اس کے فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے اس کے ساتھ ہے اس کو نصیحت کرتا ہے چھوڑ دو اسے بچانے کی ضرورت نہیں Candide اور اس کا استاد حادثہ سے بچ بچا کر شہر میں جاتا ہے- شہر میں ایک خوفناک زلزلہ آیا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے- Pangloss نے کہا:

Waht can be the sufficient reason for this phenomenon? اس ظاہرے کا اطمینان بخش سبب کیا ہوسکتا ہے؟

Candide نے جواب دیا: It is the end of the world یہ تو دنیا کا اختتام ہے-

فلسفی اس ظاہرہ کی توجیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر Candide طنزیہ انداز میں بول پڑتا ہے اس طرح ماوراء طبیعت کی چیزوں میں پڑ کر حادثات کی توجیہ وتشریح کرنا وقت کی بربادی کے مترادف ہے-

غرض کہ حادثات زمانہ، چرچوں کی دادا گری، عیسائی رہنماؤں کا خدا بن جانا اور پادریوں کا دین کے نام پر انسانیت کا استحصال کرنا جیسے واقعات نے Voltaire کو اپنا نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کردیا اور پھر جب اس نے اپنے فلسفے کا رخ پھیرا تو نام نہاد مذہبی علمبرداروں کی حیثیت اجاگر کردی- اس نے آخری وقت میں یہ یقین کرلیا تھا کہ انسان اپنی بقا کا ضامن خود ہے- اگر وہ اپنی زندگی سنوارنا چاہتا ہے تو اسے اپنی اصلاح خود کرنی پڑے گی- اس نے اس حقیقت کا بیان اپنی کتاب Candide کے اس اختتامی جملہ پر کیا ہے We must cultivate our garden (Candide,P:119) ہمیں اپنے باغ کی آبیاری خود کرنی پڑے گی-

عہد نور کی یہ تاریخی دستاویز عہد حاضر کے ان مسلمان لیڈران، خود ساختہ علما اور شب و روز قدموں پر سجدہ ریزی کرانے والے ملنگوں کے لیے درس عبرت ہے جنہوں نے انسانیت کو ذہنی غلامی کی زنجیر میں جکڑ ڈالا ہے- سیٹھوں کی پابوسی نے انہیں غرور وتکبر کی ایسی وادیوں میں دھکیل دیا ہے جہاں سے پوری دنیا ان کی نگاہ میں تاریک ہی تاریک نظر آتی ہے- وہ علمی حقائق سے منہ چراتے ہیں اور تحقیقی عمل کا جواب گالی گلوچ سے دیتے ہیں- □□□

حالات حاضرہ

ڈاکٹر خواجہ اکرام☆

ہندوستانی پارلیمنٹ مسلم مسائل پر خاموش کیوں؟

ہندوستان کے جمہوری نظام کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں تمام قوموں، نسلوں اور مذاہب کے ماننے والوں کو یکساں آئینی حقوق حاصل ہیں- اقلیت اور اکثریت کے حقوق کے تحفظ کی باتیں بھی بڑے واضح انداز میں درج ہیں- لیکن تحریر اور عمل میں فرق جس طرح دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے سو یہ تصویر یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے- ہندوستان کے اس عظیم جمہوری ملک میں کچھ طبقے، اقلیت کی بڑی اکثریت بنیادی مراعات سے محروم ہیں- لیکن اس کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ یہ ایک سوال ہے، جس پر غور کرنے کا وقت آ گیا ہے کیونکہ اب پانی سر سے اوپر بہنے لگا ہے- آج بھی اس جمہوری ملک میں مسلمانوں کو وہ مراعات حاصل نہیں ہو سکیں جس کا وعدہ آئین میں کیا گیا ہے- ہندوستانی پارلیمنٹ میں عام طور پر اس بات پر کئی بار اتفاق رائے سامنے آ چکا ہے کہ ترجیحی طور پر ان طبقوں، نسلوں، ذاتوں اور جماعتوں کو سماجی طور پر اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے گی جو تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی طور پر کمزور ہیں- لیکن اب تک اس نصف صدی میں ہندوستان کی تمام پسماندہ قوموں کے حوالے سے باتیں تو ہوئیں لیکن مسلمانوں کے حوالے سے کوئی بولنے والا نہیں ہے اور ان کی حالت زار کسی کو نظر نہیں آتی ہے- یہ اس جمہوری ملک کا ایک تاریک پہلو ہے- لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس ذمہ داری کسی پر تھوپیں یہ سمجھ لیں کہ :

یہ بزم مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

جی ہاں! یہاں اسی کو ملتا ہے جو اپنے حق کی بازیابی کے لیے آنسو نہیں بہاتا اور غیروں کے سامنے دست سوال بلند نہیں کرتا بلکہ اپنے حق کی لڑائی خود لڑتا ہے- لہٰذا اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہیں یا بے عملی یا ناکارکردگی کہ ہم نے خود اپنے لیے کچھ نہیں کیا- اسی لیے اس ملک میں ان قوموں اور جماعتوں کو تو خوب خوب مراعات مل رہی ہیں جو اپنے حقوق کے لیے کوشاں اور سرگرم ہیں- لیکن مسلمانوں کو اب تک وہ کچھ بھی نہیں مل سکا جو ان کے وجود اور بقا کے لیے ضروری ہے-

لیکن مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا جمہوری نظام اور اس کو چلانے والے بھی ذمہ دار ہیں- کسی پارٹی نے اب تک مسلمانوں کے حقوق کے لیے پارلیمنٹ میں آواز بلند نہیں کی، یہ ایک سچائی ہے-

تقریباً دو مہینے قبل پارلیمنٹ کے سرمائی اجلاس میں ڈرامے بازی کی جو تصویریں سامنے آئیں وہ افسوسناک ہیں- جب سے پارلیمنٹ کا سرمائی اجلاس شروع ہوا اور آخر تک پارلیمنٹ میں کوئی اہم کارروائی نہیں ہو سکی- اپوزیشن پارٹیوں نے پہلے ہی سے برسر اقتدار سیاسی پارٹی کو کٹگھرے میں کھڑا کرنے کی بات کی تھی سو وہ بہت ہی مضبوطی کے ساتھ اپنے منشا پر عمل کرتے ہوئے پارلیمنٹ کو معطل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی- یہ تو اچھی بات ہے کہ اپوزیشن پارٹی مضبوط رہے تاکہ برسر اقتدار پارٹی کو منمانے ڈھنگ سے کام کرنے کی مہلت نہ ملے- لیکن یہاں معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ معاملہ یہ ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں یہ چاہتی ہیں کہ کیسے اس حکومت کا خاتمہ ہو تاکہ انھیں اقتدار میں آنے کی مہلت مل جائے- اسی لیے وہ ہر ایشو پر بلاوجہ اشتعال دکھانے میں ساری طاقت صرف کرتے رہے- وہ عوام کو یہ پیغام دینے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ برسر اقتدار پارٹی حکومت چلانے میں ناکام ہو چکی ہے اور اب اس کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ حکومت میں بنی رہے- اپوزیشن پارٹیوں کا یہ رویہ افسوسناک اس لیے ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلے کو لے کر اگر حکومت کو گھیرنے کی کوشش کریں جو ملک کے حق میں ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن ان کا سارا زور اس بات پر ہوتا ہے کہ حکومت ناکام ہے- اس کے لیے انھیں انا ہزارے نام کا ایک کھلونا ہاتھ لگ گیا ہے- اس کھلونے سے وہ اس طرح کھیل کر رہے ہیں جیسے وہ ملک کے سب سے بڑے بہی خواہ ہوں- حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کی سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی بھارتیہ جنتا پارٹی ہی وہ پارٹی ہے جس نے ملک کی جمہوریت کو تار تار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہی وہ پارٹی ہے جس نے بابری مسجد کو شہید کیا، ان کے وہی لیڈر جو بابری مسجد کے گنہگار ہیں، آج پارلیمنٹ میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہیں، انھیں کوئی آئینہ دکھانے والا نہیں ہے- اگر انھیں کوئی آئینہ دکھائے تو شاید انھیں شرم تو آئے گی اور ان کی آواز تو پست ہوگی- کیا اس

☆Director:National Council for Promotion of Urdu Language,New Delhi-khwajaekram@gmail.com

پارلیمنٹ میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ انھیں آئینہ دکھا سکے؟ آج وہ انا ہزارے کی حمایت صرف اس لیے کررہے ہیں کہ اس بہانے وہ حکومت کو جھکانا چاہتے ہیں- اگر کانگریس کی جگہ یہ خود حکومت میں ہوتے تو وہ بھی یہی کرتے - کیونکہ خود انا ہزارے کی پوری تحریک کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انا ہزارے کی تحریک پارلیمنٹ کو زیر کرنے کی تحریک ہے- انا اوران کی پارٹی یہ سمجھتی ہے کہ وہ پارلیمنٹ سے بھی اوپر ہیں-ان کی یہ مہم اپنی جگہ پر لاکھ سہی مگر وہ پارلیمنٹ کو زیر نہیں کر سکتے - خیر مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ انا ہزارے کو ایک سیاسی پارٹیاں ایک کھلونے کی طرح استعمال کر رہی ہیں اور یہ سارا کھیل پارلیمنٹ میں کھیلا جا رہا ہے- اس پارلیمنٹ میں جو جمہوری نظام کا سب سے بڑا ادراہ ہے جس کا احترام تو دور اب اس کو سیاسی پارٹیوں نے سیاسی اکھاڑا بنا دیا ہے-

اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اسی سرمائی اجلاس میں اور کئی اہم مسائل پر بحث ہونی تھی جواب پس پشت ہی نہیں بلکہ وہ سب کے سب سرد خانے میں رکھ دیے گئے ہیں- مسلمانوں کے حوالے سے ایک اہم تجویز انسداد فرقہ واریت مخالف بل بھی زیر غور تھی مگر اس پر بھارتیہ جنتا پارٹی کا موقف یہ ہے کہ اس بل کی کوئی ضرورت نہیں- اسی لیے وہ پارلیمنٹ کو ایسے مسائل اور معاملے میں الجھائے رکھنا چاہتی ہے تا کہ اس طرح کے بل کو پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے - اس کے علاوہ خود برسر اقتدار پارٹی بھی اس معاملے میں مخلص نہیں کیونکہ اس بل کے حوالے سے کانگریس نے انتخاب کے دوران ہی وعدہ کیا تھا مگر اس نے بھی اس معاملے میں پہل نہیں کی ورنہ اس پورے آٹھ سال میں اس بل کو پاس نہیں کیا جا سکتا تھا یہ ماننے والی بات نہیں ہے- کانگریس بڑے بڑے ایشو کو اپوزیشن پارٹیوں کی پرواہ کیے بغیر پاس کرا چکی ہے تو اس بل کو پاس کرانے میں کیا مضائقہ تھا - بات صرف اتنی ہے کہ کانگریس بھی مسلم مسائل پر سنجیدہ نہیں ہے-

آج اپوزیشن پارٹیاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر پارلیمنٹ کو معطل کر دیتی ہیں لیکن کانگریس جو حکومت میں ہے اسے بھی کئی ایسے ایشو ہاتھ آئے مگر وہ خاموش رہی - مثلاً عشرت جہاں انکاونٹر معاملہ اور گجرات میں برسر اقتدار بی جے پی کی بدعنوانیاں اور مسلم مخالف سرگرمیاں، مگر کانگریس سمیت لیفٹ پارٹیاں بھی خاموش کیوں ہیں؟ اس کا جواب ہم مسلمانوں کو مل جل کر پوچھنا چاہیے- مسلمانوں کے ریزرویشن کے حوالے سے بھی یہی معاملہ ہے- اس ملک میں مسلمان سب سے زیادہ پسماندہ ہے لیکن اس کی فلاح اور بہبود کے لیے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا جا رہا ہے؟ مسلمانوں کے حوالے سے اتنے ایشو پارلیمنٹ میں پینڈ ینگ ہیں، ان پر کوئی آواز کیوں نہیں بلند ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں تمام ممبران پارلیمان سے بھی پوچھنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اس حکومت کو بھی گھیرنا چاہیے- اس حکومت نے صرف دکھاوے کے لیے اقلیتی امور کی وزارت قائم کی لیکن اس وزارت کی کارکردگی کیا ہے؟ یہ سوال بھی اٹھانے کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کے لیے نام نہاد جو اسکیمیں بنائی ہیں ان کے نفاذ کے لیے اب تک حکومت نے کیا اقدام کیا یہ سب وہ سوالات ہیں جن کی گونج پارلیمنٹ میں سنائی دینی چاہیے تھی لیکن آج تک کبھی کوئی آواز مسلمانوں کے حقوق کے لیے سنائی نہیں دی - اس کے لیے تمام سیاسی پارٹیاں قصوروار ہیں اور کسی حد تک مسلمان بھی ذمہ دار ہیں کیونکہ انھوں نے کبھی اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے متحد ہوکر کوئی تحریک چلائی اور نہ کسی مہم کا آغاز کیا - اگر ہندوستانی مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں بیٹھے بٹھائے تمام حقوق مل جائیں گے تو وہ خام خیالی میں ہیں کیونکہ اس جمہوری نظام میں اپنے حقوق کے لیے لڑنا ہوگا - لیکن المیہ یہ ہے کہ مسلم امہ کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے- مسلک ومشرب کے نام پر ان کے درمیان اتنے جھگڑے اور اتنی دوریاں ہیں کہ یہ متحد نہیں ہوسکتے لیکن یہ بات تمام مسلم گروپ کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں تو اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس جماعت سے تعلق رکھتا ہے- اس وقت تمام مسلمان صرف مسلمان ہوتے ہیں اور انھیں مسلمان کے نام پر ہی مارا جاتا ہے- اس لیے کم ازکم یہ حقیقت سامنے رکھ کر سیاسی اور ملی مفاد کے لیے ہندوستان میں تمام مسلم امہ کو ایک پلیٹ فارم پر آنے کی ضرورت ہے تا کہ ان کا استحصال نہ ہوسکے اور نہ ان کے حقوق سلب کیے جاسکیں- ہندوستانی مسلمانوں کو بدلتے وقت کے تناظر میں اپنے وجود اور بقا کے لیے متحد ہونا پڑے گا اور انھیں تمام اختلافات کو دور کر کے ایک پلیٹ فارم پر بھی آنے کی ضرورت ہے- اس کے علاوہ سیاسی پارٹیوں کو یہ بتانا بھی ہوگا کہ مسلمانوں کے ووٹ کے بغیر وہ کامیاب نہیں ہوسکتے اور ممبران پارلیمنٹ کو بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمان دوسری بڑی اکثریت ہیں اس لیے ان کے مسائل کو بھی پارلیمنٹ میں پیش کرنا ہوگا - اگر یہ ملک جمہوری ملک ہے تو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کیوں؟ یہ بات بھی حکومت ہند اور تمام سیاسی پارٹیوں کو ذہن نشین کرنا ہوگی- ❑❑❑

تذکار

ندیم احمد قادری☆

مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

ولادت ونسب: قائد ملت اسلامیہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ کے والد ماجد، سفیر اسلام، سیاحِ عالم، مبلغ اسلام حضرت علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری علیہ الرحمہ ۱۵/ رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق ۳/اپریل ۱۸۹۳ء بروز پیر، محلّہ مشائخاں، شہرِ میرٹھ، صوبۂ یوپی، ہندوستان، میں نامور صوفی عالم دین، نعت گوشاعر، امام وخطیب جامع مسجد ''التمش''، میرٹھ، مفتی شاہ عبدالحکیم جوشؔ وحکیمؔ صدیقی قادری علیہ الرحمہ کے ہاں پیدا ہوئے-

یہاں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ عموماً آپ کی پیدائش کا سن ''۱۸۹۲ء'' لکھا جاتا ہے؛ جب کہ تاریخی شواہد اور آن لائن کیلنڈر کے مطابق ''۱۵/ رمضان ۱۳۱۰ھ'' کو عیسوی سن ''۱۸۹۳'' تھا، نہ کہ ''۱۸۹۲''-معروف ادیب وشاعر حضرت مولانا محمد اسماعیل میرٹھی علیہ الرحمہ، جن کی نظمیں آج بھی داخلِ نصاب ہیں، آپ کے والد ماجد کے چھوٹے بھائی تھے؛ دونوں بھائیوں کی عمروں میں ۱۴ سال کا فرق تھا- مبلغِ اعظم حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ نجیب الطرفین صدیقی تھے- چنانچہ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۶ ویں پشت میں حضرت محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما تک اور سلسلۂ حسب (ماں کی طرف سے سلسلۂ نسب) ۳۲ ویں پشت میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے- آپ کے مورثِ اعلیٰ حضرت مولانا قاضی صوفی حمید الدین صدیقی خجندی ۱۵۲۵ء میں ظہیر الدین بابر بادشاہ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے تھے- اس طرح آپ کے آبا واجداد میں سے کئی حضرات قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہے-

''حیاتِ اسماعیل'' میں درج شدہ معلومات کی روشنی میں، حضرت مولانا قاضی صوفی حمید الدین صدیقی خجندی علیہ الرحمۃ تک، مبلغ اعظم کا شجرۂ نسب یہ ہے: ''شاہ محمد عبدالعلیم بن شاہ عبدالحکیم جوشؔ بن شیخ پیر بخش بن شیخ غلام احمد بن مولانا محمد باقر بن مولانا محمد عاقل بن مولانا محمد شاکر بن مولانا عبداللطیف بن مولانا یوسف بن مولانا داؤد بن مولانا احمد بن مولانا قاضی صوفی حمید الدین صدیقی خجندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم-''

(محمد اسلم سیفی بن مولانا محمد اسماعیل میرٹھی (خان بہادر)، سابق چیئرمین، میونسپل بورڈ، میرٹھ: ''حیاتِ اسماعیل (مع کلیاتِ اسماعیل)'' مرتّبہ ومدوّنہ: محمد اقبال رانا، شایع کردہ: برائٹ بکس، لاہور،: ۲۰۰۳ء، ص ۳۰ تا ۳۱)

تعلیم وتربیت: آپ نے اردو، عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی، چار سال دس ماہ کی عمر میں قرآنِ مجید ناظرہ ختم کیا اور صرف سات سال کی عمر میں قرآنِ پاک مکمّل حفظ کرلیا- بعدازاں، مدرسۂ عربیہ اسلامیہ، میرٹھ، میں داخل ہوئے- تین جمادی الاخریٰ ۱۳۲۲ھ (اگست ۱۹۰۴ء) کو والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھا، تو بقیہ تعلیم وتربیت آپ کی والدۂ ماجدہ (والدہ صاحبہ کا انتقال ۱۹۳۱ء میں اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں ہوا) اور برادرِ اکبر حضرت علامہ احمد مختار صدیقی علیہ الرحمہ نے کی- چنانچہ حضرت مبلغ اعظم نے مدرسۂ قومیہ عربیہ، میرٹھ، میں داخلہ لیا اور ۱۳۲۶ھ میں امتیازی حیثیت سے درسِ نظامی کی سند حاصل کی- دینیات کے موضوع پر نیشنل عربک انسٹی ٹیوٹ سے ڈپلوما کیا- تبلیغِ دین کے جذبے کے تحت، آپ نے علومِ جدیدہ کی طرف متوجہ ہوکر بی اے کیا اور پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی؛ میرٹھ کے مشہور حکیم احتشام الدین صاحب سے فنِّ حکمت (علمِ طب) سیکھا- اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ سے بھی آپ کو شرفِ تلمّذ حاصل تھا؛ اعلیٰ حضرت نے مبلغِ اعظم علیہما الرحمہ کو ۱۹/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صحاحِ ستّہ وغیرہا کتبِ احادیث کی روایت کرنے کی سندِ اجازت عطا فرمائی- اس سند کا عکس حضرت مبلغِ اعظم کے پچاسویں عرس شریف کے موقع پر خواتین اسلامی مشن پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، کے شائع کردہ خصوصی مجلّے ''عظیم مبلغ اسلام'' کے صفحہ ۱۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے-

زبانوں پر عبور: آپ کو دنیا کی بہت سی زبانوں پر دسترس حاصل تھی، جن میں اردو، انڈونیشی، انگریزی، جاپانی، جرمن، چینی، ڈچ،

☆Karachi Pakistan

سواحلی (افریقی)، عربی، فارسی، فرانسیسی، ملائی، ہندی وغیرہ شامل ہیں- آپ نے السنۂ شرقیہ (Oriental Language s) میں پنجاب یونیورسٹی سے سند بھی حاصل کی- آپ ایک قادرالکلام نعت گو شاعر بھی تھے اور ''علیم'' تخلّص کرتے تھے- آپ کوفن خطابت میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی؛ ماہر رضویات ومجددیات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، خلیل احمد رانا صاحب کی تالیف ''مبلغِ اسلام علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری'' کی تقدیم میں تحریر فرماتے ہیں:

''جاپان کی ایک مجلس میں، جہاں آپ نے تقریر فرمائی، ٹوکیو کے پروفیسر این- ایچ برلاس نے انگریزی زبان میں آپ کی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی آواز کو ترنّم ریز و دل آویز قرار دیا- راقم کو بھی حضرت مولانا کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے- حقیقت یہ ہے کہ اُن کی آواز میں بلا کی کشش اور کھنک تھی- اردو، عربی، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں بے تکان تقریر کرتے تھے-'' آپ کی مقررانہ و خطیبانہ صلاحیتوں کی بنا پر ہی ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مسلم مورخوں نے آپ کو ''عدیم النظیر مقرر'' قرار دیا- آپ نے اپنی زندگی کی سب سے پہلی تقریر ۱۹۰۹ء میں جامع مسجد میرٹھ میں ''میلاد شریف'' کے موضوع پر کی-

بیعت وخلافت: مبلغ اعظم علیہ الرحمہ کی بیعت وخلافت کے حوالے سے آپ کی شہزادی محترمہ ڈاکٹر فریدہ احمد صاحبہ مدظلہا العالی نے راقم الحروف سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا: ''بعض لوگ میرے والد ماجد کے متعلق لکھ دیتے ہیں کہ آپ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضلِ بریلوی کے مرید تھے؛ یہ بات درست نہیں ہے؛ صحیح یہ ہے کہ آپ اپنے برادرِ اکبر حضرت علامہ احمد مختار صدیقی کے مرید تھے؛ البتہ آپ کو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سے شرف خلافت ضرور حاصل تھا-''

اعلیٰ حضرت کے علاوہ، حضرت مبلغِ اعظم کو اپنے پیر و مرشد یعنی برادرِ اکبر حضرت علامہ احمد مختار صدیقی، قطب المشائخ حضرت ابو احمد سیّد شاہ محمد علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی عرف ''اشرفی میاں'' علیہم الرحمہ سے بھی اجازت وخلافت حاصل تھی؛ نیز، مذکورہ بزرگوں کے علاوہ، اپنے والدِ ماجد اور حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ احمد الشّمس مراکشی مدنی اور لیبیا کے صوفی بزرگ حضرت شیخ السنوسی علیہم الرحمہ سے بھی آپ نے روحانی فیوض کا اکتساب کیا؛ شیخ الدلائل حضرت مولانا عبدالحق ابن یار محمد صدیقی الہ آبادی مہاجر مکی سے (جن کی دلائل الخیرات شریف کی سند بہت معروف ہے) دلائل الخیرات کی اجازت لی-

اعلیٰ حضرت کی عنایت وشفقت: مبلغ اعظم پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں علیہا الرحمہ بڑی شفقت فرماتے اور پیار سے آپ کو ''علیمِ رضا'' کے لقب سے پکارتے؛ علاوہ ازیں، اپنے قصیدے ''اَلْاِسْتِمْدَادُ عَلٰی اَجْیَالِ الْاِرْتِدَادِ'' میں اپنے خلفا اور تلامذہ کے ذکر میں، بدعقیدہ و بد مذہب گروہ کے مقابلے میں، آپ کے علمی مقام کو یوں بیان فرمایا ہے:

عبد علیم کے علم کو سن کر   جہل کی بہل بھگاتے یہ ہیں

آپ بھی اعلیٰ حضرت سے بڑی گہری عقیدت رکھتے تھے؛ جب ۱۹۱۹ء میں حج کا فریضہ ادا کرنے گئے، تو عرب میں اعلیٰ حضرت کی غائبانہ پذیرائی اور قدر و منزلت ملاحظہ کی؛ جب حرمین شریفین کی زیارت سے لوٹے؛ تو بریلی میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر اعلیٰ حضرت ہی کی شان میں اپنی ایک منقبت پڑھ کر سنائی، جس کے ایک شعر میں اس مقبولیت کا ذکر اس طرح کیا:

عرب میں جاکے اِن آنکھوں نے دیکھا جس کی صولت کو
عجم کے واسطے لاریب وہ قبلہ نما تم ہو

حرمین شریفین سے واپسی کے اس موقع پر جب حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ نے اپنی پوری منقبت پڑھ کر سنا دی، تو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے ارشاد فرمایا:

''مولانا! میں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟ (اپنے عمامے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے، جو بہت قیمتی تھا، فرمایا) اگر اس عمامے کو پیش کروں تو آپ اس دیارِ پاک سے تشریف لا رہے ہیں، یہ عمامہ آپ کے قدموں کے لائق بھی نہیں؛ البتہ میرے کپڑوں میں سب سے بیش قیمت ایک جبّہ ہے، وہ حاضر کیے دیتا ہوں-''

چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کاشانۂ اقدس سے سرخ کاشانی مخمل کا جبۂ مبارکہ لاکر عطا فرمایا اور حضرت مبلغ اعظم نے سروقد کھڑے ہوکر، دونوں ہاتھ پھیلا کر اس جبّے کو آنکھوں سے لگایا، لبوں سے چوما، سر پر رکھا، پھر سینے سے دیر تک لگائے رہے- (ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری: ''حیاتِ اعلیٰ حضرت''، مکتبۂ نبویہ، لاہور، ص ۱۱۹ تا ۱۲۰)

مبلغ اسلام کے خلفا: مبلغِ اعظم علیہ الرحمۃ کے داماد (ڈاکٹر فریدہ

احمد صاحبہ کے شوہر) پروفیسر محمد احمد صدیقی صاحب نے مجلّہ ''عظیم مبلغِ اسلام'' (شائع کردہ: خواتین اسلامی مشن پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، ستمبر۲۰۰۳) کے صفحہ ۲۴ پر مبلغِ اعظم کے خلفا کے تحت دو ناموں ''ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (مبلغِ اعظم کے بڑے داماد یعنی مرحومہ اَمَۃ السُّبُّوح سُبُحِیَّہ صاحبہ کے شوہر) اور مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی'' کا ذکر کیا ہے۔

حضرت علامہ ابو داؤد محمد صادق رضوی صاحب دامت برکاتہم العالیہ اپنی تالیف ''شاہ احمد نورانی'' حصّہ اوّل کے صفحہ ۱۲ پر رقم طراز ہیں:

''مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنے والد بزرگوار علیہ الرحمہ سے بیعت وخلافت اور سلسلۂ عالیہ قادریہ رضویہ میں منسلک ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ نے پاکستان و بیرونِ پاکستان اپنی وسیع تبلیغی مساعی و مسلسل دینی جدو جہد اور شریعت وطریقت کی خدمات سرانجام دے کر اپنے والد ماجد کی نیابت وجانشینی کا حق ادا کیا ہے۔''

حضرت مبلغِ اعظم علیہ الرحمہ کے خلفا میں تیسرا نام ''فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا حافظ قاری مفتی محمد فضل الرحمٰن رحمانی صدیقی قادری مدنی علیہم الرحمہ'' کا بھی ملتا ہے؛ چنانچہ جناب شیخ محمد عارف قادری ضیائی مدنی علیہ الرحمہ اپنی تالیف ''سیدی ضیاء الدین احمد القادری'' جلدِ دوم (شائع کردہ: حزب القادریہ، لاہور) کے صفحہ ۴۰۹ پر رقم طراز ہیں:

''مبلغِ اسلام حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی قادری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۶۵ھ میں، جب کہ آپ (حضرت علامہ فضل الرحمٰن مدنی) کی عمر اکیس برس تھی، سندِ حدیث کے ساتھ جمیع سلاسل کی اجازت و خلافت عنایت فرمائی اور وہ تسبیح عنایت فرمائی جو سیدنا اعلیٰ حضرت عظیم البرکۃ (امام احمد رضا خاں فاضلِ بریلوی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ (حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ) کو عطا فرمائی تھی۔ اس دن آپ (حضرت فضل الرحمٰن مدنی) کے سب سے بڑے بیٹے حضرت حافظ حبیب الرحمٰن قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا عقیقہ تھا۔''

درس وتدریس اور تلامذہ: حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی علیہ الرحمہ اعلیٰ حضرت کے مرید وخلیفہ قطبِ مدینہ حضرت علامہ ضیاء الدین احمد رحمانی صدیقی (حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اولاد کو ''رحمانی صدیقی'' یا صرف ''رحمانی'' کہا جاتا ہے۔) قادری مہاجر مدنی علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند و جانشین اور قائدِ ملّتِ اسلامیہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے سسر اور ہم سبق تھے؛ آپ اور قائدِ ملت اسلامیہ دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی استاد حضرت شیخ القرا حَسَنُ الشاعر علیہ الرحمہ کے دامنِ شفقت میں قرأت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مبلغِ اعظم حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ پیشہ ور معلّم یا مدرّس تو نہ تھے؛ لیکن، تبلیغِ دین کے جذبے کے تحت، آپ نے یہ میدان بھی خالی نہیں چھوڑا۔ خانۂ کعبہ میں درسِ قرآنِ مجید بھی دیتے رہے، مسجد نبوی شریف میں بابِ سیدنا صدیق اکبر کے سامنے ستون سے متصل بیٹھ کر گنبد خضرا کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بہت سے طلبہ کو تفسیر جلالین اور کتب احادیث بخاری شریف ومشکوٰۃ شریف بھی پڑھاتے رہے اور ان کے سوالات کے جوابات بھی ارشاد فرماتے رہے۔ متعدد علمائے کرام کو مسجد نبوی میں حدیث کی سندیں بھی عطا فرمائیں۔ مبلغِ اعظم کے شاگردوں کی تعداد سے متعلق، رفیقِ قائدِ ملتِ اسلامیہ حضرت سید شاہ فرید الحق صاحب دامت برکاتہم العالیہ مجلّہ ''عظیم مبلغِ اسلام'' (شائع کردہ: خواتین اسلامی مشن پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، ستمبر۲۰۰۳) کے صفحہ ۲۹ پر فرماتے ہیں:

''کتنوں نے شاگردی اختیار کی، صحیح تعداد کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ تھوڑا بہت اندازہ ایک سووینئر (souvenir) کے اُن الفاظ سے ہوتا ہے جو ماریشس میں ۱۹۴۱ء میں مولانا کی آمد کے موقع پر انگریزی میں چھپا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اُن کے لاتعداد شاگرد ہیں، جن میں صرف ماریشس میں ان کے دس (۱۰) ہزار شاگردوں پر اس جزیرے کو فخر ہے۔''

الغرض، دنیا کے بہت سے لوگوں کو آپ کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے چند خاص خاص شاگردوں کے نام یہ ہیں: (۱) علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی (۲) مولانا فضل الرحمٰن انصاری (۳) مسٹر عزیز ایچ عباسی، نیوزی لینڈ (۴) ڈاکٹر محمد عالم، آسٹریلیا (۵) جے ماجد، سیلون (۶) ڈاکٹر ایچ ایس منشی، مدیر دی جینوئن اسلام، سنگاپور (۷) سید ابراہیم الشگوف (۸) میجی گن یونیورسٹی کے ماہرِ تعلیم مسٹر عبد الباسط (۹) ۱۹۵۰ء میں شرقی ریاستہائے متحدہ کے مفتیِ اعظم حضرت عبد الرحمٰن لٹسر آپ کے شاگرد ہوئے (۱۰) جانشینِ قطبِ مدینہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی نے مبلغِ اعظم علیہم الرحمہ سے ''ادب'' وغیرہ کی کتب کا درس لے کر، علوم کی تکمیل کی اور سند حدیث کے ساتھ

جمیع سلاسل کی اجازت وخلافت حاصل کی۔

تبلیغ دین اور غیر مسلموں کا قبول اسلام: مبلغِ اعظم نے اپنی پوری زندگی میں تقریباً ۳۵ بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے پہلا حج ۱۹۱۹ء میں ادا فرمایا۔ آپ نے اپنی تبلیغی زندگی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۴ء سے کیا۔ تبلیغِ دین کے سلسلے میں بے شمار ممالک کے دورے کیے۔ آپ کی تبلیغ کے نتیجے میں مسلمان ہونے والے افراد کی تعداد کے متعلق آپ کے خلف الرشید حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ نے آپ کے عرس شریف کے موقع پر ''مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کانفرنس'' سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میرے والد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں تقریباً ایک لاکھ سے زائد عیسائیوں کو، ملحدوں کو، ہندوؤں کو، کافروں کو مسلمان کیا۔''

(خطاب: مورخہ ۲۱ر مئی ۱۹۹۹ء (بعد نمازِ عشا)، مل والا اپارٹمنٹ، رنچھوڑ لائن، کراچی)

سب سے زیادہ، عیسائیوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ بہت سے قادیانیوں کی بھی توبہ اور ایمان کا آپ سبب بنے۔ آپ کی تبلیغی مساعی سے ایک طرف غیر مسلموں نے اسلام سے رشتہ جوڑا، تو دوسری جانب آپ کے علم وعمل سے متاثر ہو کر لاکھوں مسلمان آپ کے دامن سے وابستہ ہوئے۔ چنانچہ آپ کے داماد پروفیسر محمد احمد صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

''پوری دنیا میں آپ کے ۱۰ لاکھ سے زیادہ مرید تھے۔''

(مجلّہ ''عظیم مبلغ اسلام''، ص ۲۴)

تعمیری، تنظیمی اور تحریکی سرگرمیاں: آپ نے بے شمار ملکوں میں، متعدد مساجد، لائبریریز، تعلیمی، تبلیغی ادارے قائم فرمائے، ہسپتال اور یتیم خانے تعمیر کرائے، کئی ایک رسالے (مثلاً ۱۹۳۱ء میں سنگاپور سے رئیل اسلام، سنگاپور ہی سے ۱۹۳۶ء میں دی جینوئن اسلام وغیرہ) جاری کیے۔ مبلغِ اعظم نے کئی تنظیمیں بھی تشکیل دیں۔ مثلاً کمیونزم اور لادینیت کے خلاف سنگاپور میں، ۱۹۴۹ء میں ''تنظیم بین المذاہب'' قائم فرمائی۔ اس موقع پر آپ کی خدمات کے اعتراف میں مختلف ادیان کے پیشواؤں نے متفقہ طور پر آپ کو "His Exalted Eminence" (فضیلت مآب) کا خطاب دیا۔ سعودی حکومت نے حاجیوں پر ٹیکس لگایا تو آپ نے بڑی کوشش اور بحث ومباحثہ کر کے والی سعودی عرب سلطان عبدالعزیز بن سعود کو حج ٹیکس ختم کرنے پر مجبور کر دیا؛ آپ کے اس کارنامے سے آج تک دنیا بھر کے مسلمان فائدہ اُٹھا رہے ہیں، لیکن صد افسوس! اکثر مسلمان اپنے محسن کے اس عظیم احسان سے ناواقف ہیں۔

تحریک پاکستان میں کردار: تحریک پاکستان میں بھی آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس تحریک میں آپ نے قدم قدم پر مسلمانوں کی عملی طور پر رہ نمائی فرمائی۔ آپ ہی کی کوششوں سے عرب ممالک سمیت تمام عالمِ اسلام مطالبۂ پاکستان کا حامی بنا۔ (آپ کے فرزند قائدملّتِ اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے عالمِ شباب میں، تقاریر وعملی کردار کے ذریعے، تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور ۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۳ء یعنی تا دمِ رخصت پاکستان کے لیے آپ کی خدمات کسی سے مخفی نہیں)۔ بانیِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ مبلغِ اعظم حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ قیامِ پاکستان کے تین دن بعد، پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی خصوصی دعوت پر مرکزی عید گاہ مسجد، جامع کلاتھ مارکیٹ، کراچی میں آپ نے عید الفطر کا خطبہ دیا اور نماز بھی پڑھائی، جس میں قائد اعظم، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر وغیرہم زعماے ملک نے شرکت کی۔ قائد اعظم نے آپ کو ''گشتی سفیرِ پاکستان'' کا خطاب دیا۔ آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا نذیر احمد صدیقی خجندی علیہ الرحمہ سے بھی قائد اعظم بہت سے امور میں رہ نمائی لیتے تھے، یہاں تک کہ جب قائد اعظم نے ایک پارسی لڑکی رتن بائی سے نکاح کرنا چاہا تو مولانا نذیر احمد ہی کے پاس لے کر آئے؛ آپ نے اسے مسلمان کیا اور نکاح پڑھایا۔

تصنیفی خدمات: مبلغ اعظم علامہ شاہ عبد العلیم صدیقی ایک بہترین ادیب بھی تھے؛ چنانچہ آپ نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود، چند تصانیف وتالیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں: احکامِ رمضان المبارک؛ بہارِ شباب؛ دیو بندی مولویوں کا ایمان؛ ذکرِ حبیب حصّۂ اوّل و دوم؛ فرت من قسورہ؛ کتاب التصوف مسمّٰی بہ ''لطائف المعارف''؛ مرزائی حقیقت کا اظہار؛ المراۃ القادیانیہ (عربی)؛ The Clarion Call; The Elementary

Teachings of Islam (for Hanafis); How to Preach Islam; The Mirror;

وغیرہ کتب شامل ہیں-

تین تمنائیں: آپ کی تین بڑی تمنّائیں تھیں: ایک تو یہ کہ ؎

مدینے جاؤں؛ نہ آؤں، وہیں پہ رہ جاؤں
درِ حبیب پہ قصّہ تمام ہو جائے

چنانچہ اسی امید پر بروز پیر، ۲۰؍صفر المظفر ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۳؍جنوری ۱۹۴۷ء کو آپ نے رہائش کے لیے مدینۂ منورہ میں زمین خریدی، جس کا قطعۂ تاریخ سید اسلام الحق سیفی ندوی متوطن مسعود منزل، بلیا و مدیر "علم و ادب، دہلی" نے حسب ذیل کہا (امداد صابری: "تذکرہ شعراءِ حجاز"، دہلی، ۱۹۶۹ء-) ؎

بارک اللہ عالمِ مقبول
شد بہ تملیک قطعۂ ارضی
ثمرۂ یافت ایں زِ عشقِ رسول
چوں رسیدم بہ ایں خبر سیفیؔ
گفتم از ارضِ طیبہ مضمونش
بارک اللہ لک، بلا کم و کاست
(۱۳۶۶ھ)

قیامِ پاکستان کے بعد اس قطعۂ ارضی پر ایک مکان بنوا کرا سے "وقف علی الاولاد" کر دیا اور شرط رکھ دی کہ اگر میری کوئی نرینہ اولاد نہ رہے تو یہ مکان مسجدِ نبوی کی ملکیت میں شامل کر لیا جائے-

آپ کی دوسری تمنّا یہ تھی کہ موت سنّتِ نبوی کے مطابق ۶۳ برس کی عمر میں آئے- چنانچہ جب آپ کی عمر شریف ۶۲ سال کی ہوئی تو ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۳ء) میں آپ نے مستقل طور پر مدینۂ منورہ ہی میں رہائش اختیار کر لی اور کہیں آنا جانا، یہاں تک کہ تبلیغی دوروں پر بھی موقوف کر دیا- جب کوئی آپ کو کہیں آنے کی دعوت دیتا تو فرماتے:

"میری زندگی کا صرف ایک سال رہ گیا ہے، وہ میں یہاں مدینۂ منورہ ہی میں گزاروں گا-"

وصال: چنانچہ آپ کی یہ تمنا اور پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ ۲۲ اور ۲۳ ذی الحجہ (اتوار اور پیر) کی درمیانی شب ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲؍اگست ۱۹۵۴ء کو مدینۂ منورہ ہی میں آپ کا وصال ہوا- آپ کی نمازِ جنازہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کے دادا سسر، قطبِ مدینہ حضرت علامہ ضیاء الدین احمد قادری مدنی علیہم الرحمہ نے پڑھائی- حضرت مبلغِ اعظم علیہ الرحمہ نے اپنے ایک خطاب کے دوران، جس کی آڈیو کیسٹ راقم کے پاس موجود ہے، چند نعتیہ اشعار پڑھے، جن میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

قریبِ روضۂ اقدس اگر مدفن میسر ہو
دلِ مضطر کو آغوشِ لحد آغوشِ مادر ہو

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنت البقیع میں امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مبارک قدموں میں آپ کو دفن کے لیے جگہ عطا کر کے آپ کی یہ تیسری خواہش بھی پوری فرما دی- اِس فقیر نے عرض کیا ہے ؎

مِل گیا مدفن قریبِ روضۂ اقدس انھیں
یعنی مقبولِ خدا ہے دعوتِ عبد العلیم

میں اپنے اس مضمون کا اختتام رفیق قائد ملت حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی ضیائی دامت برکاتہم العالیہ کے ان کلمات پر کرتا ہوں:

"آپ (علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ) کے خانوادے اور آپ کی دینی، سماجی، اصلاحی اور تبلیغی خدمات پر بہت کچھ تحریر کیا جا سکتا ہے؛ لیکن افسوس صد افسوس! کہ ہم نے اس عظیم عالم اور مبلغِ اسلام، جن کی تعمیر و تشکیلِ پاکستان میں دیگر علما و مشائخ اہل سنت کے ساتھ عظیم و بیش بہا خدمات ہیں، (کو) فراموش کر دیا- اگر دیانت داری سے توجہ کی جائے تو آپ کی خدمات سنہری حروف میں تحریر کیے جانے کے قابل ہیں- احقر نے اپنے بعض اکابر سے یہ بھی سنا ہے کہ علامہ موصوف کی ایمانی، روحانی اور تبلیغی صلاحیتوں کو دیکھ کر بعض غیر مسلموں نے یہاں تک کہا کہ ان عظیم صلاحیتوں کی شخصیت اگر ہمارے پاس ہوتی، تو ہم نہ صرف ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے؛ بلکہ ان کو اس سے کہیں زیادہ بلند مقام دیتے- بقولِ شاعر ؎

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنھیں خاک چھان کر"

(مجلّہ "عظیم مبلغ اسلام" شائع کردہ: خواتین اسلامی مشن- پاکستان، گلشن اقبال، کراچی، ص ۳۲)

□□□

علمی مذاکرہ

دینی و مسلکی سرگرمیوں کے حوالے سے

نوجوان علما کے خیالات

نئی نسل قوم کی مستقبل ہوا کرتی ہے-آج جو خلف ہے وہ کل سلف ہوگا اور جو طالب وشاگرد ہے وہ کل مطلوب واستاذ ہوگا- یہی وجہ ہے کہ شباب الامۃ بذور مستقبلھا کہا جاتا ہے اور ہر جگہ نوجوانوں کی تعمیر وتشکیل پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور ان کی باتیں سنی جاتی ہیں- نوجوانوں کو نظر انداز کر کے کسی قوم کے اچھے مستقبل کی امید نہیں کی جا سکتی- ماہ نامہ جام نور نئی دہلی نے اپنے اول روز سے نوجوانوں کو ترجیح دیا ہے، ان کی تعمیر و تشکیل کی باتیں کی ہیں، ان کی علمی، قلمی ولسانی تربیت کی ہے اور مستقبل کے تئیں انہیں حساس وفکر منداور مستعد کرنے کی کوشش کی ہے- زیر نظر نواجوان علما کا علمی وفکری مذاکرہ بھی جام نور کی اسی روایت کا ایک حصہ ہے- مولانا ذیشان احمد مصباحی مدیر ماہ نامہ جام نور نے چند ممتاز نوجوان علما سے دینی ومسلکی سرگرمیوں کے تعلق سے ان کے خیالات واحساسات جاننے کی کوشش کی ہے- یہ مذاکرہ خاصا دلچسپ ہے جو جوان علما کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے- ان کے یہ جذبات واحساسات ہمارے بڑوں کے لیے بھی کئی جہت سے قابل مطالعہ ہیں- مذاکرے میں شریک نئے علما میں مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں- ابھی حال ہی میں بڑے مخدوم صاحب حضرت شیخ سعد خیرآبادی کی تصوف پر تاریخی کتاب مجمع السلوک کا ترجمہ مکمل کیا ہے- مولانا مجیب الرحمٰن علیمی الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کر رہے ہیں- نیز جامعہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد میں استاذ ہیں- مولانا ظفر الدین برکاتی جامعہ ہمدرد نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں- نیز گزشتہ کئی سالوں سے ماہ نامہ کنزالایمان دہلی کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں- مولانا اشرف الکوثر مصباحی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے تقابل ادیان وثقافت سے ایم اے کرنے کے بعد اب اسلامیات میں ایم اے کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ آئیڈیل ایجوکیشن سینٹر کے نام سے انگریزی و عربی تحریر وتقریر کا ایک ادارہ بھی دہلی کے اندر چلا رہے ہیں، اور مولانا ارشاد عالم نعمانی جامعہ ہمدرد نئی دہلی سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ساتھ ہی برکاتی لائبریری، دارالقلم نئی دہلی کی ذمہ داری اور ماہ نامہ ماہِ نور نئی دہلی کی ادارت کو سنبھالے ہوئے ہیں- یہ سب نوجوان علما ہیں، جو کسی نہ کسی جہت سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں- امید کی جاتی ہے کہ ان کی دردمندانہ آواز کو مخلصانہ سماعت میسر آئے گی- **خوشتر نورانی**

ذیشان احمد مصباحی: دینی ومسلکی سرگرمیوں کے حوالے سے نئی نسل کے خیالات کیا ہیں؟ یہ آج کی اس محفل کا موضوع ہے- ماہ نامہ جام نور نئی نسل کا نمائندہ رسالہ ہے- نئی نسل کے علما اور طلبہ کو اس نے پہلے بھی ترجیح دیا ہے اور آج بھی تمام نئے علما کے افکار وخیالات کی ترسیل کا ذریعہ بن رہا ہے- عصر حاضر میں دین ومسلک کی تبلیغ واشاعت کا جو کام ہو رہا ہے، اس سے آپ حضرات کہاں تک متفق ہیں؟ اس وقت جو بھی کام ہو رہا ہے اس میں کیا اصلاحات ہونی چاہیے، نئے ماحول نئے مسائل کو جنم دیتے ہیں، جب زمانہ بدلتا ہے تو مسائل بھی بدلتے ہیں اور مسائل کے تعلق سے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی آتی ہے اور ان کو حل کرنے کے اصول اور طریقے بھی بدلتے ہیں- میڈیا نے حالات کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے- آج سے پچاس سال قبل جو مسائل بہت اہم تھے، آج وہ غیر اہم ہو گئے ہیں اور پچاس سال پہلے جن مسائل کا کوئی تصور نہیں تھا آج وہ مسائل ہمارے سامنے ہیں- اس تناظر میں جام نور نے ان مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے آپ نوجوان علما کو مدعو کیا ہے-

اس محفل میں ہم نے انہی علما کو مدعو کیا ہے جو جوان علما میں کسی نہ کسی جہت سے امتیازی حیثیت کے حامل ہیں- آپ تمام حضرات اس دعوت پر تشریف لائے- ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کے گراں قدر خیالات سامنے آئیں گے اور ان سے ہمارے ارباب بست و کشاد اور بالخصوص نوجوانوں کے لیے کارآمد باتیں نکل کر سامنے آئیں گی- ہم اپنی گفتگو کا آغاز مولانا مجیب الرحمٰن علیمی سے کرتے ہیں- مولانا! ہم آپ سے جاننا چاہتے ہیں کہ اہل وسنت وجماعت کی دینی ومسلکی سرگرمیاں آپ کی نظر میں کس حد تک قابل اطمینان واتفاق ہیں؟ کیا رائے ہے آپ کی؟

مولانا مجیب الرحمٰن علیمی: کام ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، اس سے اتفاق ہے یا نہیں ہے، یہ الگ چیز ہے، کام کس طرح ہونا چاہیے اور اس کی

نوعیت کیا ہونی چاہیے، اس تعلق سے یہ رائے ہے کہ ہر انسان اور بالخصوص ہر مسلمان، اس کا تعلق ایک طرف حق سے ہوتا ہے اور دوسری طرف خلق سے، انسان کا رشتہ خالق سے کتنا مضبوط اور مخلوق کے ساتھ اس کے رشتے کتنے اچھے ہیں، اس پر بھی غور کرنا چاہیے اور اپنا احتساب کرنا چاہیے- یہ دونوں کام جب ہو جائیں پھر ہم تبلیغ واشاعت اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں- میرے خیال میں اسلام کی تفہیم، تبلیغ اور اشاعت سے پہلے اسلامی تعلیمات کی عصری مزاج کے مطابق تسہیل کرنا نہایت ضروری ہے- لیکن اس کے ساتھ ہمیں ہمیشہ خالق اور مخلوق کے ساتھ اپنے رشتے کا احتساب کرتے رہنا ہوگا- اس کے بغیر ہمارا کوئی بھی کام دینی نقطۂ نظر سے نہ تو مفید ہو سکتا ہے اور نہ ہی نتیجہ خیز-

جہاں تک یہ بات ہے کہ آج کے نوجوان اپنا رول کہاں تک ادا کر رہے ہیں، تو اس تعلق سے میں کہوں گا کہ جس طرح ہم بیٹھ کر اپنے بڑوں پر تنقید کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ نہیں کیا، فلاں نے یہ نہیں کیا، اسی طرح کل ایسا دن آنے والا ہے کہ ہمارے بعد آنے والی نسل اسی طرح ہماری شکایت کرے گی بلکہ اور شدید لفظوں میں ہماری مذمت کرے گی- اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کا احتساب تو کر رہے ہیں لیکن اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کہیں نہ کہیں کوتاہی برت رہے ہیں- اس لیے ضرورت اس باکی ہے کہ ہم ذاتیات، شخصیات اور تعصّبات سے اوپر اٹھیں اور اسلامیات کی تبلیغ واشاعت کا کام کریں- جس طرح صدر الشریعہ نے بہار شریعت لکھ کر شریعت کی تفہیم وتبلیغ کا کام کیا، حافظ ملت نے ایک مشن کے تحت کام کیا تو اس کام کی اہمیت آج بھی ہے- وہ مثبت اور پائیدار کام ہے- ہمیں بھی مثبت اور پائیدار کام کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے-

ذیشان احمد مصباحی: برکاتی صاحب! موجودہ دور میں دینی ومسلکی جو کام ہو رہا ہے، آپ اس سے کہاں تک متفق یا مطمئن ہیں؟

مولانا ظفر الدین برکاتی: کام جو کچھ ہو رہا ہے وہ شخصی اور ذاتی طور پر ہو رہا ہے، یہی مفید بھی ہے اور کامیاب بھی- اجتماعی سطح پر ہمارے یہاں کام نہیں ہو رہا ہے- اس لیے کہ جماعتی سطح پر اجتماعیت کا تصور ابھی محکم نہیں ہو سکا ہے-

جماعتی کام کے سلسلے میں دوسری بات یہ کہوں گا کہ آج جو کچھ کام ہو رہا ہے وہ منفی نوعیت کا زیادہ ہو رہا ہے اور مثبت نوعیت کا کام کم ہو رہا ہے- ہم مارکیٹ میں ہیں- ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص علمی اور معیاری کتاب لکھتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے فنڈ کے انتظام کے لیے مارے مارے پھرتا ہے- دوسری طرف منفی کتاب آج لکھی جاتی ہے، کل کمپوزنگ ہوتی ہے، تیسرے دن پروف ریڈنگ ہوتی، چوتھے دن پریس جاتی ہے اور پانچویں دن چھپ کر مارکیٹ میں آجاتی ہے- اس کے برخلاف جو مثبت کام ہو رہا ہے وہ اس کے بہ نسبت کم ہو رہا ہے، سست روی سے ہو رہا ہے اور انفرادی سطح پر ہو رہا ہے- اس حوالے سے مولانا یٰسین اختر مصباحی، مولانا محمد احمد مصباحی، مولانا عبد المبین نعمانی اور مفتی نظام الدین رضوی وغیرہ ہمارے آئیڈیل ہیں- وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں- ان کا ماننا ہے کہ مثبت کام کی عمر ہوتی ہے- اس سے کام کرنے والے اور ان کے کام ان کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں جب کہ منفی سرگرمیوں میں مصروف حضرات چند دنوں زندہ رہتے ہیں پھر کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں ہوتا- ہمیں بھی چاہیے کہ مثبت رویہ اپنائیں اور مثبت کام کریں- اندھیریوں کو کوستے رہنے سے بہتر ہے کہ ہم خود اپنے حصے کا چراغ جلائیں-

مولانا اشرف الکوثر مصباحی: جس عہد میں ہم جی رہے ہیں اس میں کام کرنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس عہد کے تقاضوں کو سمجھیں- ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں اور اس صدی کے چیلینج سے چشم پوشی کرتے ہوئے دینی ومسلکی کام کا حق ادا نہیں کر سکتے- اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جس کے مقابل کام کر رہے ہیں اس کی صلاحیتوں، طاقتوں اور ہتھیاروں کی نوعیت کا اندازہ لگائیں- اگر ہمارے پاس ان سے بہتر ہتھیار نہ ہو تو کم تر بھی نہ ہو- ہمیں مدارس میں یہ بات پڑھائی جاتی ہے کہ **من لم یعرف أهل زمانه فهو جاهل** - جو اپنے زمانے کے مسائل کو نہ سمجھے وہ جاہل ہے- میرا سوال یہ ہے کہ یہ بات ہمیں صرف پڑھائی جائے گی یا اس پر عمل بھی ہوگا- آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے مسائل ہیں، اسلامک بینکنگ کی بات ہو رہی ہے- ہر دن اس طرح کے نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں- ایسے میں ہمارے ارباب مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ وہ جو کچھ اپنے طلبہ کو پڑھا یا سکھا رہے ہیں کیا اس سے ان جدید تقاضوں کی تکمیل اور ان نئے مسائل کی تفہیم ہو رہی ہے-

نوجوانوں کے تعلق سے ایک بات کہنا چاہوں گا کہ کچھ لوگ مدارس سے نکل کر یونیورسٹی میں آرہے ہیں اور وہاں آنے کے بعد وہ So Called Intellectul بن رہے ہیں- پھر وہ اپنے ہی بڑوں پر تنقید وتعریض کر رہے ہیں، یہ غلط رویہ ہے جس سے احتراز کرنے کی ضرورت

ہے- اس حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانے میں جو کچھ کیا وہ ان کے زمانے کی ضرورت تھی، آج کی ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم آج کی ضرورت کو سمجھیں اور اس کے مطابق ہم دوسروں کو کوسنے کی بجائے خود کام کریں- ایک اسکالر نے کہیں لکھا ہے کہ جس وقت یورپ میں چاند پر جانے کی تیاریاں چل رہی تھیں اس وقت ہندوستان کے علما اس مسئلے میں جھگڑ رہے تھے کہ مسجد کا منبر کتنا اونچا ہونا چاہیے- میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ہم نے اپنی زندگی کا انداز نہیں بدلا اور زمانے کے تقاضے کے مطابق کام نہیں کیا، تو پھر پچاس سالوں بعد سوائے حسرت و یاس کے ہمارے حصے میں کچھ نہیں آئے گا- اس وقت جب پھر تمام نئے شعبہ ہائے حیات میں غیروں کا قبضہ ہو چکا ہوگا تو پھر مرادآباد کی سرزمین سے کوئی شخص اٹھے گا اور کہے گا کہ ہمیں فلاں میدان میں نمائندگی نہیں دی گئی اور ہمارا فلاں حق نہیں دیا گیا- جب کہ یہ زمانہ حق مانگنے کا نہیں، اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اپنا حق حاصل کرنے کا ہے- ہم ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں- تنقید بری چیز نہیں ہے اگر تعمیری ہو، لیکن میرے نزدیک تنقید سے زیادہ اہم احتساب ہے- ہمیں اپنا احتساب کرنے کی ضرورت ہے- ہر کوئی خود سے سوال کرے کہ میں کیا کر رہا ہوں، اگر یہ عمل شروع ہو گیا تو پھر کسی کو دوسرے پر تنقید کی فرصت ہی نہ رہے گی، شکایت ختم ہو گی اور کام ہونے لگے گا-

ذیشان احمد مصباحی: مولانا اشرف الکوثر کی گفتگو کے بین السطور میں کہیں نہ کہیں یہ بات ہے کہ عصر حاضر میں دین و مسلک کے حوالے سے جو کام ہو رہا ہے، یہ عصر حاضر کے چیلنجز اور تقاضوں کے مطابق نہیں ہو رہا ہے- میں مولانا ارشاد عالم نعمانی صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ آپ مولانا اشرف الکوثر صاحب سے کتنا اتفاق کرتے ہیں؟

مولانا ارشاد عالم نعمانی: عصر حاضر میں دین و مسلک کا جو کام ہو رہا ہے وہ بڑی حد تک عصری تقاضوں کے مطابق ہے مگر اس کے باوجود ہمارے جو دینی ادارے ہیں، مدارس و خانقاہ وغیرہ، ان میں عصری ضرورتوں کے پیش نظر بعض اصلاحات کرنے کی ضرورت ہے- مثلاً ہمارے اہل مدارس کو چاہیے کہ وہ اپنے یہاں سے جس طرح اساتذہ کو فارغ کرتے ہیں اسی طرح مبلغین کو بھی فارغ کریں- وہاں سے محررین بھی پیدا ہوں- اسی طرح آج کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں ہمارے افراد پہنچیں- اب اس کے لیے افراد سازی کا کام کیسے ہو، اس مسئلے پر ہمارے ذمہ داروں کو سوچنا چاہیے- اس کے ساتھ ہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی نے آج سے تقریباً سو سال پہلے جماعت کے عروج و ارتقا کے لیے دس نکاتی فارمولہ پیش کیا تھا مگر افسوس ہے کہ اس پر اب تک عمل نہیں ہو سکا، اس فارمولے میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ملکی اور صوبائی سطح پر ہمارے اخبارات نکلیں مگر آج سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس پر عمل نہیں ہوا، کیوں نہیں ہوا اور اس کے نقصانات کیا ہو رہے ہیں، ان پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے- اسی طرح تقسیم کار کی ضرورت ہے- فاضل بریلوی نے یہ بھی کہا تھا کہ جو جس کام کا اہل ہو اس کو اس کام میں لگایا جائے- یہ تقسیم عمل کا فارمولہ تھا اور صلاحیتوں کے صحیح استعمال کا فارمولہ تھا، اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت تھی جو نہیں دی گئی-

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی: عصر حاضر میں دین و مسلک کا کام ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، یہ زیر بحث تو ہے ہی، اس کے ساتھ اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی بھی کام کا کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے- یہ محرک عموماً دو طرح کا ہو سکتا ہے، دینی اور دنیاوی، ہم جو کام کریں اس میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ ہمارے کام کا محرک محض دین ہو دنیا نہ ہو-

اللہ کریم کا ارشاد ہے: **و ماخلقت الجن و الانس الا لیعبدون** - ہم نے انسانوں اور جناتوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا- **یعبدون** کی ایک تفسیر **یعرفون** سے کی گئی ہے جس کے مطابق تخلیق کا مقصد معرفت الٰہی کا حصول ہے- یہ بات اتنی بنیادی ہے کہ اگر ہم اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں تو سارے مسائل از خود حل ہو جائیں گے- اس سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں- ایک یہ کہ ہم خود معرفت الٰہی حاصل کریں اور خود کو صالح اور نیک بنائیں اور دوسری بات یہ کہ ہم اس صالح پیغام کو دوسروں تک پہنچائیں اور دوسروں کی صالحیت کے لیے کوشاں ہوں- یہی وجہ ہے کہ جب معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے تو بندے کا تعلق اس کے رب سے استوار ہوتا ہے اور اس طرح وہ دوسروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی عمل خیر انجام دیتا ہے- انسان کے مقصد تخلیق کے حوالے سے ان بنیادی پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بہر حال ہمیں کام کرنا ہے، اپنی صالحیت کے لیے بھی اور دوسروں کی صالحیت کے لیے بھی- اور یہ کام ہر سطح پر ہونا چاہیے- علمی و تحقیقی سطح پر، تبلیغی و

دعوتی سطح پر اور اصلاحی وسماجی سطح پر، ہم جب اہل سنت کے دینی ومسلکی کاموں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہر سطح پر کام بہت کم ہوا ہے اور جو کام ہوا بھی ہے وہ زیادہ تر انفرادی سطح پر ہوا ہے، مثلاً دعوتی میدان میں تن تنہا علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی نے بڑا کام کیا، علمی سطح پر کام کرنے والوں میں عصر حاضر میں علامہ غلام رسول سعیدی اور مفتی نظام الدین رضوی کا نام لیا جاسکتا ہے- اور میں تو کہتا ہوں کہ اس پر بہت پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے- ہر زمانے میں کام کرنے والے کم ہی رہے ہیں- اگر ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ہمارے اکابر نے بھی ہر دور میں اپنے زمانے کی کوتاہ عملیوں کا رونا رویا ہے- اس لیے پریشان ہونے کی بجائے ہمیں کام کرنا ہے-

ذیشان احمد مصباحی: مجیب الرحمٰن صاحب! لیجیے پھر آپ کی باری آ گئی- عصر حاضر میں دینی ومسلکی کام کے حوالے سے تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ جو کام ہو رہا ہے وہ عصری ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا ہے- اور یہ کہ ہر سطح پر اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے، اس تعلق سے آپ کی رائے کیا ہے کہ دینی ومسلکی کاموں میں اگر اصلاح وترمیم کی جائے تو کس طرح کی جائے؟ اصلاح وترمیم کے فارمولے آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

مولانا مجیب الرحمٰن علیمی: اصلاح وترمیم کی بات کوئی نئی نہیں، ہر زمانے میں یہ عمل ہوتا رہا ہے- آج ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں اس کے بھی ہم سے کچھ تقاضے اور مطالبے ہیں- ہمارے اسلاف کا ہم پر حق ہے اور ہمارے اخلاف ہم سے مطالب ہوں گے، ہم سے کام کا مطالبہ کریں گے- ایسی صورت میں ہمیں کام کرنے کی ضرورت ہے- کام کا آغاز اپنی ذات کی اصلاح سے ہو اور پھر اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کے لیے کوشش کی جائے کیوں کہ الخلق عیال اللہ کہا گیا ہے- ایسے میں اللہ کے پورے کنبے کی خیر وصلاح ہمارا فریضہ ہے-

یہ زمانہ فتنوں کا ہے، اس زمانے میں کون کیا کر رہا ہے اور کیا نہیں کر رہا ہے، یہ گفتگو کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے حصے کا کام کریں- آج ہمارے یہاں اجتماعیت کا فقدان ہے اور اس کے بے شمار نقصانات بھی اٹھانے پڑ رہے ہیں- بہر کیف! ایسی صورت حال میں ہمیں چاہیے کہ انفرادی طور پر کام کریں اور اجتماعیت کے لیے کوشاں رہیں- میں یہاں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ اجتماعیت ایثار چاہتی ہے، اس لیے اجتماعیت کی بات بھی وہ کریں جو صاحب ایثار ہوں- جو صرف اپنی ذات کا طواف کرنے کے عادی ہیں انہیں اجتماعیت کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا-

ذیشان احمد مصباحی: برکاتی صاحب! اس فتنے کے زمانے میں دینی ومسلکی کام کے جو طریقے رائج ہیں، ان میں اصلاح کے حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

مولانا ظفر الدین برکاتی: دعوتی وتبلیغی کاموں میں اگر اصلاح کی بات ہو رہی ہے تو اس وقت ہمارے سامنے اصلاح وتبلیغ کی دو عالمی تحریکیں ہیں دعوت اسلامی اور سنی دعوت اسلامی اور دونوں ہی اپنوں کی طرف سے ہی شدید یلغار کی زد میں ہیں- دعوت اسلامی کی بنیاد علامہ ارشد القادری، علامہ شاہ احمد نورانی اور دوسرے علمائے اہل سنت نے رکھی تھی اور انہی لوگوں نے مولانا الیاس قادری کو اس کا امیر بنایا اور جیسے امیر کی ضرورت تھی ویسے ہی امیر کا انتخاب کیا- کیوں کہ میرے علم کی حد تک دعوت اسلامی کا قیام تبلیغی جماعت کے بالمقابل ہوا تھا اور تبلیغی جماعت اپنے مسلک کے عالموں کی جماعت نہیں ہے بلکہ عوام کی جماعت ہے- اس لیے علمائے اہل سنت نے ایسے عالم کا بطور امیر انتخاب کیا جیسے عالم کی ضرورت تھی- ظاہر ہے کہ مولانا الیاس قادری معروف معنوں میں باضابطہ فارغ التحصیل عالم دین نہیں ہیں لیکن جس منصب پر وہ فائز ہیں اس کی ضرورتوں کے مطابق یقیناً وہ علم رکھتے ہیں- ایسی صورت میں ان کے خلاف واویلا مچانا اور یہ کہنا کہ وہ عالم نہیں ہیں، فضول ہے-

اصلاح وتربیت کے ضمن میں ایک بات میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں بہت جلدی سے کسی کے بارے میں یہ حکم صادر کر دیا جاتا ہے کہ فلاں ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، فلاں جماعت سے نکل گیا، وغیرہ وغیرہ- میں کہتا ہوں کہ وہ شخص ہمیں میں سے کسی کا مرید، کسی کا شاگرد اور کسی کا بیٹا ہوتا ہے- ایسے میں اس کے پیر، اس کے استاذ اور اس کے باپ اس کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ اسے یہ بات کیوں نہیں سمجھاتے کہ تم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ غلط ہے، صحیح راہ یہ ہے- معذرت کے ساتھ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمارے بعض بڑے اپنے چھوٹوں کے اوپر ہاتھ رکھنے اور اصلاح کرنے سے قبل تنقیص کا عمل شروع کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ تنقیص کا انجام بھی تنقیص ہوا کرتا ہے-

آپ نے کہا کہ جام نور نوجوانوں کا نمائندہ رسالہ ہے، اس لیے میں نوجوانوں کو یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ وہ بولنے اور لکھنے سے زیادہ کرنے

پر یقین رکھیں، رسالوں اور کتابوں میں لکھنے سے کچھ نہیں ہوگا، اگر اصلاح چاہتے ہیں تو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں خود کرنے کی کوشش کریں-

ذیشان احمد مصباحی: اشرف الکوثر صاحب! دینی ومسلکی کاموں میں اصلاح وترمیم کے حوالے سے آپ کی رائے کیا ہے؟

مولانا اشرف الکوثر مصباحی: میری باری آپ نے سب کے آخر میں رکھی ہے اور میری باری آتے آتے جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ میرے احباب میں سے کوئی نہ کوئی کہہ جاتے ہیں- خیر! جہاں تک دینی ومسلکی کاموں میں اصلاح کا سوال ہے تو میں پہلی بات یہ کہنا چاہوں گا کہ اصلاح اصلاح کے انداز میں ہو، اصلاح تخریب اور اہانت کے انداز میں نہیں ہونی چاہیے- ہمارے یہاں اصلاح کا جو طریقہ ہے وہ بالعموم تنقید اور تنقیص سے لبریز ہے- اس رویے کو ترک کرنے کی ضرورت ہے- ایک بات میں یہاں یہ کہوں گا کہ اعلیٰ حضرت نے جو دس نکاتی فارمولہ پیش کیا ہے اور اس میں تقسیم عمل کی جو بات کی ہے اس پر بطور خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے- اسی طرح ہماری پوری جماعتی انرجی منفی کاموں پر صرف ہو رہی ہے اس رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے- ہمیں مثبت کاموں کی طرف توجہ کرنی ہوگی- ہمارے پاس کثیر خانقاہیں ہیں اور تنظیمیں ہیں، اگر یہ سب مل کر چاہیں تو ہندوستان میں آکسفورڈ اور میڈیائی تاج محل کی تعمیر ہو سکتی ہے- میں یہاں ایک بات اور کہنا چاہوں گا کہ ہمارے رویے میں تشدد اور انانیت کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں- ہم جب کوئی کام کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہم نے کوئی تیر مار دیا اور جب ہمارا آپس میں اختلاف ہوتا ہے تو طعن وتشنیع اور تشدد کی تمام حدوں کو پار کر جاتے ہیں، اس لیے اپنے رویے میں اعتدال اور اخلاص لانا ضروری ہے- ہمیں اپنے دین اور عقیدے پر ثابت قدم اور متصلب رہنا چاہیے لیکن جہاں بات تشدد کی آئے وہاں فوراً اپنا قدم روک لینا چاہیے-

اسی حوالے سے ایک بات اور نوٹ کر لیں کہ آج ہم سب کو ''میں'' کی تھیوری سے باہر آنا ہوگا اور ''ہم'' کے اصول پر عمل کرنا ہوگا- اگر آج ہمارے تمام پیران کرام، تمام مشائخ، علما اور اہل وجاہت وثروت ''میں'' سے نکل کر ''ہم'' میں آجاتے ہیں تو ہمارے آپسی بیشتر مسائل حل ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہم مثبت کام کرنے کی بجائے منفی کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں- جماعت اہل سنت کے جو افراد ہیں- وہ مختلف مشرب، درس گاہ اور علاقے سے وابستہ ہیں اور ہر کوئی اپنے سلسلے کو اعلیٰ اور دوسرے کو ادنیٰ اور زیر کرنے میں کوشاں ہے- اس رویے کو بدلنا ہوگا- خلاصہ یہ کہ دینی ومسلکی کاموں میں اصلاح کے ساتھ میرے نزدیک رویے میں اصلاح زیادہ ضروری اور زیادہ مفید ہے-

ذیشان احمد مصباحی: دینی ومسلکی کاموں میں اصلاح وترمیم کے حوالے سے مختلف مفید آرا آئی ہیں، مولانا ارشاد صاحب! آپ ان باتوں پر اضافہ کیا فرمانا چاہیں گے؟

مولانا ارشاد عالم نعمانی: میں یہاں صرف ایک بات کا ذکر کروں گا اور وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں قیادت کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے ہمیں بے شمار مسائل درپیش ہیں- مسائل حل ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتے ہیں، اس کی جہاں اور بہت سی وجوہات ہیں وہیں میرے خیال میں ایک وجہ یہ ہے کہ ہم جس شخص کو اپنا مذہبی قائد بناتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ سیاسی، علمی، تنظیمی وتحریکی اور سماجی وملی تمام امور میں قیادت کا فریضہ وہی انجام دے جب کہ اس طرح کی جامع خصوصیات شخصیت کا ہمارے زمانے میں فقدان ہے- اس لیے ہونا یہ چاہیے کہ ہمارے بیچ مذہبی طور پر جو سب سے زیادہ ذی علم اور ذی شعور ہو اسے مذہبی قیادت دی جائے، سماجی اور ملی طور پر جو سب سے زیادہ ذی صلاحیت وباشعور ہو اسے ملی وسماجی قائد بنایا جائے اور جس کے اندر علمی وتحقیقی صلاحیتیں زیادہ ہوں اسے تحقیق وعلم کی زمام سونپی جائے- کچھ سالوں قبل الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے یہ آواز آئی تھی کہ وہاں دار القضا کا قیام عمل میں آرہا ہے اور ملک بھر میں اس کی ذیلی شاخیں ہوں گی اور اسی طرح تحریر وتصنیف کے حوالے سے ایک بورڈ ہوگا جس کی تائید کے بعد کوئی کتاب جماعت کی کتاب سمجھی جائے گی، لیکن افسوس کہ عملی طور پر یہ فارمولہ نہیں آیا جس کا مجھے قلق ہے اور میری خواہش ہے کہ یہ کام ہونا چاہیے اور اسی طور پر ہونا چاہیے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا-

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی: دینی ومسلکی کاموں میں اصلاح کے حوالے سے بہت ہی مفید مطلب باتیں آئی ہیں- خاص طور پر تقسیم کار کا مسئلہ آیا، تنظیم کا مسئلہ آیا اور قیادت کی بات آئی، یہ تینوں بہت اہم ہیں، میرے خیال میں قیادت کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا اگر دو جگہوں پر بطور خاص اصلاح ہو، مدارس اور خانقاہوں میں- مدارس ہمارے علمی مراکز ہیں اور خانقاہیں دعوتی وروحانی مراکز، ہر کوئی کسی نہ کسی مدرسے کا فارغ ہے اور کسی نہ

کسی خانقاہ سے وابستہ ہے- اب ایسے میں مدارس میں علمی اسپرٹ تیز ہو، اہل مدارس عصری علمی ضرورتیں کیا ہیں ان کے مطابق اپنے نصاب و نظام میں تبدیلی لائیں اور اہل خانقاہ دعوتی و تبلیغی اور روحانی واصلاحی تربیت کریں تو بڑی حد تک قیادت کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا اور ایک عظیم علمی و دعوتی انقلاب بھی برپا ہوگا، لیکن یہ سوچنا کہ کسی ایک قائد کے بینر تلے سب جمع ہوجائیں یہ بظاہر ممکن نظر نہیں آرہا ہے، ویسے اللہ کی قدرت سے کوئی بعید بھی نہیں **لعل الله يحدث بعد ذلك امراً**-شاید اللہ کسی ایسی جامع صفات شخصیت کو پیدا فرمادے جس پر سب کا اتفاق ہوجائے-

جہاں تک دینی کاموں میں اصلاح کی بات ہے تو واقعۃً یہ عصر حاضر میں ضروری ہے اور ہر سطح پر ضروری ہے-مثلاً ہمارا جو علمی کام ہو اس میں عصر حاضر کے موضوعات کا انتخاب کیا جائے، اسی طرح بیان واسلوب میں وہ طرز اختیار کیا جائے جو عصر حاضر کا ہے-تقریروں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے، بے جا چیخ و پکار بند کی جائے، لوگ اب تعلیم یافتہ ہورہے ہیں اور سنجیدہ باتیں سننا چاہتے ہیں، اس حوالے سے میرا عملی تجربہ ہے-کون کہتا ہے کہ آج اچھے سننے والے نہیں ہیں، اچھے سننے والے ہیں شرط یہ ہے کہ آپ اچھے لب ولہجے میں گفتگو کیجئے-قرآن نے موعظۂ حسنہ کی بات کہی ہے، ہمیں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق حکمت اور موعظہ حسنہ سے دعوت دینی ہوگی اور احسن طریقے پر دین کو پیش کرنا ہوگا-اسی طرح ہمارا بہت بڑا دعوتی نیٹ ورک ائمہ کا ہے جہاں سے بڑے پیمانے پر دعوت وتبلیغ کا کام انجام پاسکتا ہے-بلکہ وہ سب لوکل مراکز ہیں جو ہر علاقے کو کنٹرول کرتے ہیں-اگر ائمہ کی اصلاح ہوجائے تو پورے ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں عظیم دعوتی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے-ائمہ کی اصلاح کیسے ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مدارس سے آرہے ہیں یا خانقاہ سے، ان کی وہاں اچھی تربیت ہو تو وہ بڑا کام کرسکتے ہیں-

مولانا ظفرالدین برکاتی: اس راؤنڈ میں تنظیم وتحریک کے حوالے سے بہت باتیں ہوئیں-اس تعلق سے میں ایک بات کہوں گا کہ صدر سکریٹری والی تنظیم مت بنائیے-انفرادیت میں تنظیم بنائیے اور اجتماعیت میں تحریک بنائیے، انفرادیت میں تنظیم کی مثال دیکھنی ہو تو علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ ارشد القادری اور علامہ یٰسین اختر مصباحی انفرادیت میں تنظیم کی بہترین مثالیں ہیں-یہ شخصیتیں انفرادیت میں تنظیم ہیں-انہوں نے انفرادی طور پر وہ کام کیا جو ایک تنظیم کا کام ہے، تو میں قارئین کو اور بطور خاص جوانوں کو یہ پیغام دوں گا کہ وہ صدر سکریٹری والی تنظیم کا مزاج ختم کریں، انفرادیت میں وہ تنظیم قائم کریں اور اجتماعیت میں تحریک، جب تک تحریک نہ ہو تنظیم بنانے کا خواب نہ دیکھیں، ورنہ ہوگا یہ کہ آج صدر سکریٹری لوگ بنیں گے، کل اختلاف ہوگا، پرسوں اخباری بیان بازی ہوگی اور اس کے بعد تنظیم بکھر جائے گی-

ذیشان احمد مصباحی: تشدد کیا ہے؟ اور دین ومسلک کی تبلیغ پر اس کے اثرات کیا پڑتے ہیں؟ اور اس کو کیسے ختم کیا جائے؟

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی: تشدد خواہ نظری ہو خواہ عملی، دونوں کو مسترد کیا جانا چاہیے-اس کا کوئی فائدہ نہیں، نہ اسلام میں اس کے لیے کوئی جگہ ہے-البتہ بعض جگہوں پر بعض باتیں بظاہر تشدد معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ درحقیقت تشدد نہیں ہوتیں، مثلاً جہاد وغیرہ-اور جہاں تک تشدد کو ختم کرنے کی بات ہے تو اس کے لیے ہم کو مختلف سطح پر مختلف نقطۂ اتفاق کا لحاظ رکھنا ہوگا مثلاً جب بات انسانیت کی ہوگی تو نقطۂ اتفاق انسانیت ہوگی، بات مذہب اور لامذہبیت کی ہوگی تو ہمارا نقطۂ اتفاق مذہب ہوگا، بات اگر اسلام کی ہوگی تو نقطۂ اتفاق اسلام ہوگا، اسی طرح نیچے چلے جائیں، اور اس سلسلے میں ''کلمہ سواء'' کا قرآنی اصول پیش نظر رہے-**يا اهل الكتب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم**-اس سے تشدد کو بڑی حد تک ختم کیا جاسکتا ہے-

مولانا مجیب الرحمٰن علیمی: تشدد کسی بھی مذہب میں جائز نہیں، یہ بالکل غلط ہے-اختلاف ہو تشدد نہ ہو-اختلاف تو ہوگا-اللہ تعالیٰ علم دینے والا ہے-وہ اپنے کسی بندے کو کوئی ایسا علم دیتا ہے جو دوسرے کو نہیں دیتا، فقہی مذاہب کی بنیاد اختلاف رائے پر ہے، تشدد پر نہیں، اختلاف کے باوجود ہم تشدد سے دور رہ سکتے ہیں-اپنی بات پر اصرار خدائی کا دعوی ہے، تشدد سے دور رہنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم علم نافع اور عمل صالح اختیار کریں، اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہوں گی تو گھر میں بھی تشدد ہوگا، ماں اور بیوی سے بھی تشدد ہوگا، اس لیے اگر ہم تشدد سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم کو علم نافع اور عمل صالح سے آراستہ ہونا ہوگا ورنہ تو تشدد ہوگا ہی-

مولانا ظفرالدین برکاتی: ہم ایسی سوسائٹی میں رہتے ہیں، جہاں مختلف فکر اور نظریے کے لوگ رہتے ہیں اور نباہ کیسے ہوتا ہے ہم جانتے ہیں-ہم تصلب پر قائم رہیں اگر ہم باپ ہیں تو اپنے آپ کو باپ سمجھیں اور اسی پر قائم رہیں، اس میں تشدد نہ کریں، گویا اگر ہم تصلب پر قائم رہیں گے تو

تشدد خود بخود دور ہو جائے گا، تشدد سے نجات کا راستہ یہ ہے کہ ہم ظنوا المومنین خیرا پر عمل کریں، حسن ظن رکھیں، ہم نے یہی چھوڑ دیا ہے اسی وجہ سے تشدد نظر آ رہا ہے، اگر ہم حسن ظن کو اپنالیں تو سارا تشدد ختم ہو جائے، بس یہی تشدد کی بنیاد ہے-

مولانا اشرف الکوثر مصباحی: دیکھئے تشدد کا سلسلہ شروع سے چلا آ رہا ہے- تشدد کس وجہ سے ہوتا ہے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے، تشدد کبھی علم کی گہرائی کے ساتھ تکبر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور کبھی جہالت کی وجہ سے- دوسری بات یہ کہ تشدد سے نجات کی صورت یہ ہے کہ ہم کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے مختلف سطح پر اپنے مشترکہ مسائل کے لیے جمع ہونے کی کوشش کرنے چاہیے، باہمی احترام اور محبت ہو، محبت سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں، اگر ہم ان باتوں پر عمل پیرا ہوں تو تشدد خود بخود ختم ہو جائے گا اور مسائل حل ہو جائیں گے- ہم کسی بھی شخص کو نبی کا درجہ دینے کی کوشش نہ کریں، مسلکی تشدد خود ختم ہو جائے گا اور جب کسی کو وہ درجہ دینے کی کوشش کی جائے گی تو تشدد ہوگا-

مولانا ارشاد عالم نعمانی: یہاں تین الفاظ ہیں تصلب، تشدد اور صلح کلیت- اعتقادی اور ضروری مسائل پر سختی کے ساتھ قائم رہنے کا نام تصلب ہے اور اس پر عمل کے لیے دوسروں کو مجبور کرنے کا نام تشدد ہے اور صلح کلیت یہ ہے کہ مسائل میں بعض فرض، واجب، سنت اور بعض حرام و مکروہ اور خلاف اولیٰ ہوتے ہیں- اب اگر ان مسائل میں ان کے درجے کے لحاظ سے قائم نہ رہا جائے بلکہ اس میں سستی اور کوتاہی کی جائے تو یہ صلح کلیت ہے- اب خلاف اولی مسائل میں انسان کو اختیار ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے لیکن اگر اس کی بنا پر کسی کو کوئی صلح کلی کہتا ہے تو یہ صلح کلیت نہیں ہوگی- یہ مسئلہ ہمارے یہاں لوگوں پر زیادہ واضح نہیں ہے-

مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی: تصلب یہ ہے کہ حق کو حق کے مقام پر رکھا جائے اور باطل کو باطل کی جگہ پر رکھا جائے اور تشدد یہ ہے کہ کسی بھی چیز کو اس کے مقام سے بڑھا کر پیش کیا جائے اور صلح کلیت یہ ہے کسی بھی چیز کو اس کے مقام سے گرا دیا جائے- پھر تصلب کے الگ الگ درجے ہیں- اسلام میں تصلب یہ ہے کہ ضروریات وظنیات اسلام پر قائم رہا جائے اور سنیت میں تصلب یہ ہے کہ ضروریات وظنیات اہل سنت پر قائم رہا جائے، رہے اس کے علاوہ فروعی مسائل تو اس میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو صلح کلی نہیں کہا جا سکتا-

آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ الحمدللہ! اہل سنت کے طلبہ کی ایک بڑی جماعت یونیورسٹیز کی جانب رخ کر رہی ہے اور لوگ اعلیٰ عصری تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے صلاحیتیں اکثر یوں ہی ضائع ہو رہی ہیں، کم ہی لوگ دین کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں- کچھ لوگ باصلاحیت ہیں اور جذبہ رکھتے ہیں تو معاشی مسائل کی وجہ سے وہ فکر معاش میں مشغول ہو گئے ہیں اور دین کی خدمت کے لیے خواہش کے باوجود موقع نہیں نکال پا رہے ہیں، کاش! جماعت کے مخیّر حضرات اس طرف توجہ کریں اور ایسے باصلاحیت طلبہ کو فارغ البال اور فکر معاش سے آزاد کر کے ان کی صلاحیتوں کے دینی استعمال کی راہ ہموار کریں تو یہ ملت کی بڑی خدمت ہوگی-

مولانا اشرف الکوثر مصباحی: ذیشان صاحب! ہم سب کی طرف سے آپ کا، مولانا خوشتر نورانی کا اور تحریک جام نور کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ حضرات نئے جوش اور ولولے، نئی فکر، عصری تدبر اور بصیرت کے ساتھ دین و مسلک کی اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں- ہم آپ کا اس بات کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ آپ نے اس تاریخی اور اہم مذاکرے کے لیے ہمیں اس لائق سمجھا کہ ہم اپنی بات جام نور کے ذریعے جماعت کے ارباب حل وعقد تک پہنچائیں-

اس کے ساتھ میں ایک بات اور بھی کہوں گا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اس محفل کے میزبان ہیں اور اس حیثیت سے آپ کا کام خود کہنا نہیں ہم سے کہلوانا ہے- مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی یہاں ایک دوسری حیثیت بھی ہے کہ آپ بھی ایک نوجوان عالم ہیں- اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ان مسائل پر جو یہاں زیر بحث آئے، آپ کے خیالات بھی آئیں- آپ کے خیالات کی شمولیت کے بغیر یہ مذاکرہ میرے خیال میں ناقص رہے گا-

تمام شرکائے مذاکرہ: ہم مولانا اشرف الکوثر صاحب کی باتوں سے اتفاق کرتے ہیں-

ذیشان احمد مصباحی: دین و مسلک کا جو بھی کام ہو رہا ہے وہ کافی نہ سہی، لیکن مایوس کن بھی نہیں ہے- آپ یہ نہ دیکھیں کہ کچھ لوگ ابھی بھی سانپ کی لکیریں پیٹ رہے ہیں، آپ یہ دیکھیں کہ جماعت میں مجموعی طور پر کام نہ ہونے کا احساس اور کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے- اسی طرح

میں زمانے کا رونا بھی نہیں روتا- مجھے یقین ہے کے جدید سائنس اور جدید ذرائع ابلاغ اسلام کے خلاف نہیں اسلام کے حق میں ہیں- عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کے امکانات روشن ہیں- اگر کمی ہے تو ہماری پیش کش کی، لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ اللہ کا دین کسی مخصوص فرد یا جماعت کی احسان مندیوں کی مرہون منت نہیں ہے- آج اسلام کی اشاعت کا فریضہ وہ انجام دے رہے ہیں جو آبائی طور سے اس دین سے وابستہ نہیں تھے- اسی طرح مسلک اہل سنت اور طریق صوفیہ کے فروغ واشاعت اور قبولیت کے لیے بھی اکیسویں صدی کا ذہن تیار ہے- یہ اور بات ہے کہ یہ ذہن اہل سنت کی فکر اور طریق صوفیہ کو قبول کرنا چاہتا ہے، اس لیے تبلیغ واشاعت کے مرحلے میں فکر، عقیدہ اور رویے کو اہمیت دینی ہوگی- اکیسویں صدی کا جو ذہن تیار ہو رہا ہے، یہ خالص فطری اور اسلامی ہے- اس میں تعصّبات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے- نہ شخصیت پرستی کے لیے کوئی گنجائش ہے- اس صدی میں فرد کی جگہ فکر کو اہمیت ہوگی- میں مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ کہوں گا کہ ہرامت اور قوم کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں قحط الرجال یعنی افراد کا فقدان ہوتا ہے- ہمارا المیہ یہ ہے کہ افراد کے ہوتے ہوئے ان کا صحیح استعمال نہیں ہو پا رہا ہے- صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں یا اپنے مرحلۂ تشکیل میں صحیح طور سے پروان نہیں چڑھ پا رہی ہیں- یہ تشویش ناک صورت حال ہمارے بڑوں کے لیے یقیناً دعوت فکر ہے- اس کے ساتھ تصلب، تشدد اور صلح کلیت کے حوالے سے عرض کروں گا کہ حق کو حق کی جگہ پر رکھنا اور باطل کو باطل کی جگہ پر رکھنا تصلب ہے- حق کو باطل سے گڈمڈ کرنا صلح کلیت ہے اور حق وباطل کے جو درجات ہیں ان کا خیال نہ رکھنا اور اپنی ذاتی اغراض وترجیحات کے مطابق اصل کو فرع یا فرع کو اصل بنانا، منصوص کو غیر منصوص اور غیر منصوص کو منصوص بنانا، اختلافی اور فروعی مسائل میں اپنے موقف پر اس طرح اصرار کرنا کہ اپنی رائے سے اختلاف کو قرآن سے اختلاف کے مترادف ٹھہرایا جائے، یہ تشدد ہے- آپ سب حضرات کا بے پناہ شکریہ کہ آپ ہماری دعوت پر تشریف لائے، ہمیں اپنے قیمتی وقت اور گراں قدر آرا سے نوازا- اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی شان کریمی کے مطابق اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے- (آمین)

بقیہ: اظہار خیالات: اس فہرست میں زیادہ تر نام بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے بعد کے ہیں، ایسے میں مشاہدات پر مشتمل تحریریں نہیں پیش کی جاسکیں، کیوں کہ ہمارے محققین وناقدین اور سوانح نگاران اس وقت بیدار ہوئے جب آزاد ہندوستان میں مسلمانوں اور مسلم نقوش سے نفرت وبغاوت کا پودا ثمر بار ہونے کو تھا اور حتی المقدور یہ کوششیں کی جارہی تھیں کہ مسلمانوں کی خدمات کی ایک ایک علامت ردی کی ٹوکری میں ڈال کر آگ کے حوالے کر دیا جائے- یہ تو خارجی ذہنیت تھی دوسری طرف داخلی سطح پر اس وقت تک سید احمد رائے بریلوی، شاہ اسماعیل دہلوی اوران کے رفقا کو مجاہدین آزادی کی صفوں میں استحکام مل چکا تھا- اذاھبت ریح الایمان، جب ایمان کی باد بہاری چلی، ''سیرت سید احمد شہید''، ''سوانح احمدی'' جیسی کتابوں کی تصنیف پر پوری قوت وتوانائی جھونکی جا چکی تھی اور ایسے اسلوب وانداز میں یہ کتابیں لکھی گئی تھیں کہ ان پر آپ کو اعتراض بھی نہ ہو، ان میں اپنے آبا کی تعریفیں تو تھیں کھلے عام سنی وخانقاہی علما کی مذمتیں نہیں تھیں، نام کی نشاندہی کے بغیر لفظ ''بدعتی'' سے انہیں مخاطب کیا جارہا تھا- وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم بھی انہی کے اسالیب وانداز اور مطمح نظر کو پیش نظر رکھ کر اپنے آبا اور علمائے اہل سنت کی سوانح اور خدمات کو موثر انداز میں پیش کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوسکا، ہم نے جہاں کہیں علامہ کی ذات وخدمات پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو علامہ کے حوالے سے دلائل کی تلاش سے زیادہ ہم نے دوسروں کے weak points تلاش کیے اور پیش کش کا وہی پرانہ اور سوسالہ فرسودہ طرز اختیار کیا جس میں زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت نہیں تھی- ہر آن دنیا بدل رہی تھی، لوگ اپنے بزرگوں کی تصانیف کو نئی زبان اور نیا تیور دینے میں کوشاں تھے ہم اس وقت بھی منطقی قیل وقال اور فتوی نویسی کی زبان استعمال کر رہے تھے، ظاہر ہے خود ہماری تحریک ہمارے لیے وبال جان بن گئی اور وہ طبقہ جسے سنی ودیوبندی سے کوئی مطلب اور سروکار نہیں تھا وہ بھی محض ہمارے رویے اور زبان سے اکتا گیا، اس نے بھی ہمارے بزرگوں پر کام کرنا گوارہ نہ کیا اور ہم راتوں کے جلسوں اور ھاوھو سے اتنے خوش گمان تھے کہ نشیمن لٹتا رہا اور ہم رات کے تھکے ماندے دن دن بھر بستر استراحت پر دراز رہے- اپنے ان نقائص پر ہم ایک محاسبانہ نظر ڈالیں اور کہیں کہ کیا ہم سے زیادہ دیگر لوگوں نے علامہ فضل حق خیرآبادی پر ظلم وستم کیا ہے؟ علامہ فضل حق خیرآبادی کا حق ہم نے اب بھی ادا نہیں کیا ہے، بلکہ ڈیڑھ سو سال بعد باضابطہ کام کا آغاز کیا ہے- ❑❑❑

اظہارِ خیالات

اس کالم میں آپ سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور ملی کسی بھی مسئلہ پر اپنی فکر اور اپنے خیال کا برملا اظہار اور بے لاگ تبصرہ کر سکتے ہیں جو ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جائے گا، واضح ہو کہ اس سلسلے میں آپ کی تحریر مختصر اور جامع ہونی چاہیے.........................(ادارہ)

ڈاکٹر عبدالسلام کی تصویر کا دوسرا رخ عبرت آموز ہے

غلام نبی کشافی
آنچار (صورہ) سری نگر (کشمیر)

مکرمی مولانا خوشتر نورانی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ...... پاکستان کے معروف سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں کافی عرصہ پہلے کشمیر میں ایک ہفت روزہ اخبار کے چند قارئین کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ آیا وہ مسلمان تھے یا قادیانی؟ لیکن اس موضوع پر جو چند مراسلے شائع ہوئے تھے وہ کچھ زیادہ وزنی یا علمی نہیں تھے بلکہ ان میں زیادہ تر زور اس بات پر تھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی نہیں تھے- اس وقت میں نے بھی چاہا تھا کہ میں بھی اس موضوع پر کچھ لکھوں مگر میرے پاس ڈاکٹر موصوف کے قادیانی ہونے کے بارے میں ٹھوس ثبوت نہیں تھے- نیز معروف عالم مولانا وحیدالدین خان صاحب نے اپنی بعض تحریروں میں جب بھی ڈاکٹر عبدالسلام کا ذکر کیا تو ایک عظیم مسلم سائنس داں کے طور پر کیا ہے- اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہونے والے معروف ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں کافی عرصہ پہلے ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں کئی خصوصی شمارے شائع ہوئے تھے لیکن ان میں بھی ان کی عقائد ونظریات کے حوالے سے کوئی واضح تحریر پڑھنے کو نہیں ملی تھی بلکہ دوسرے کسی اسلامی رسالے میں بھی ان کے بارے میں کوئی تحریر آج تک میری نظر سے نہیں گزری ہے- لیکن اس بار ماہنامہ جام نور جنوری ۲۰۱۲ء کے شمارے میں جب جناب محمد متین خالد صاحب کا مضمون ڈاکٹر عبدالسلام تصویر کا دوسرا رخ پڑھنے کو ملا تو ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں صحیح تصویر سامنے آئی اور اب یہ بات کسی مزید دلیل کی محتاج نہیں رہی کہ وہ واقعی قادیانی تھے اور انہوں نے ختم نبوت کا انکار اور مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا اقرار کر کے اپنے گمراہ کن عقائد کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت بھی برباد کر دی ہے-

جناب محمد متین خالد صاحب پاکستان کے رہنے والے ہیں- ہندوستانی رسائل میں ان کی مضامین پڑھنے کو نہیں ملتے ہیں- تاہم میں نے ان کی قادیانی فتنہ کے حوالے سے کئی کتابیں پڑھی ہیں اور ان سے بہت فائدہ بھی ملا اور اس بار ان کا مذکورہ مضمون پڑھ کر انتہائی خوشی ہوئی- ان کا اسلوب تحریر محققانہ ہوتا ہے اور انہوں نے اپنے مضمون میں تحقیقی انداز میں ڈاکٹر عبدالسلام کے قادیانی ہونے اور ان کی مسلم دشمنی کے بارے میں ایسے شواہد اور ثبوت جمع کر دیے ہیں جن کا انکار یا رد کرنا آسان نہیں- ان کا یہ مضمون خاصی طور پر ان علما و اہل دانش کے لیے چشم کشا ہے جو سیکولر نظریات کے حامل ہوتے ہیں اور سیکولر ترازو میں ہی اسلامی تعلیمات کو ناپنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ قادیانیوں کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ مانتے ہیں اور اب حال ہی میں یہاں تک دعویٰ کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کبھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں- انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں ظل نبی ہوں- (دیکھئے: الرسالہ، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص: ۱۲، ۱۳) اس طرح قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے والے جمہور علما کے فتوے کو کمزور یا بے اثر ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مذکورہ مضمون سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ نبوت کیا تھا اس لیے ڈاکٹر عبدالسلام ان کو نبی مانتے تھے اور ان کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کرتے تھے- مگر افسوس کہ مولانا وحیدالدین خان صاحب اپنی ہی تحریر کو بھول گئے ہیں جس میں انہوں نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ مرزا قادیانی نے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا- اطمینان کے لیے یہاں خان صاحب کے الفاظ بھی نقل کیے جاتے ہیں:

''مرزا صاحب کی غلطی میں مزید شناعت اس لیے پیدا ہوگئی کہ انہوں نے صاف لفظوں میں اپنے رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کر دیا جو ختم نبوت کے بعد اجماعی طور پر کفر کو مستلزم ہے۔'' (تجدید دین،ص:۶۹)

یہ اقتباس خان صاحب کی تضاد بیانی کی منہ بولتی تصویر پیش کرتی ہے، لیکن افسوس کہ اس بار خان صاحب کو بہت دور کی سوجھی ہے۔ آپ نے جناب محمد متین خالد صاحب کا وقیع مضمون شائع کر کے بہت بڑا کام کیا ہے، کیونکہ اس سے بہت سے لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور ڈاکٹر عبدالسلام کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر سامنے آئے گا، بلکہ جو افراد بعض شعبوں میں اہم رول انجام دینے کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں اور خود کو مسلم بھی کہتے ہیں، مگر عقائد کے لحاظ سے وہ اسلام اور مسلمانوں سے حسن ظن نہیں بلکہ بغض و کینہ رکھتے ہیں اور محض اسلامی نام رکھنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں، ایسے لوگوں کو بے نقاب کرنے کا وقت آچکا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے اور حق کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

جو بات حق ہے، اسے برملا کہو ہمدم   جہاں میں کس سے بھلا سب کو پیار ہوتا ہے

جام نور ایک رسالہ نہیں ایک تحریک ہے

اقبال سہیل اعظمی
مدرسہ فیض مشائخ العلوم، بسو (گجرات)

مولانا خوشتر نورانی صاحب !السلام علیکم...... جام نور نے اب اپنی انفرادیت واہمیت کا لوہا منوالیا ہے۔ جدید طرز تحریر، منفرد اسلوب بیان اور دیگر رسائل وجرائد کی روایتی ڈگر سے ہٹ کر اس نے مذہبی صحافت کو نئی زندگی عطا کی ہے، فکر ونظر اور تنقید وتحقیق کے اچھوتے زاویوں سے نسل نو کو واقفیت بخشی ہے، اپنے انقلاب آفریں تحریروں سے پژمردہ تخیلات کی تشکیل جدید کی ہے اور عصر حاضر میں ملت اسلامیہ جن امراض کا شکار ہوگئی تھی ان کا شافی علاج وسد باب کر کے گویا دست مسیحا کا کام کیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ صرف ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جو رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے مشن کی تکمیل کر رہا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ علامہ کے وصال کے بعد ان کی انقلابی صداؤں سے ملت اسلامیہ کی سماعت محروم ہوگئی تھی۔ الحمد للہ! آپ نے جام نور کے ذریعے وہ تسلسل دوبارہ قائم فرما کر گویا علامہ علیہ الرحمہ کی جانب سے ملی ہوئی علمی وراثت کا حق ادا کر دیا۔ آج یقیناً آپ کا قلم رواں ہے لیکن اس کی روشنائی میں علامہ علیہ الرحمہ کا خون جگر شامل ہے، جن کا یہ احسان ہماری قوم زمانے تک فراموش نہیں کر سکے گی۔

یہ بھی علامہ علیہ الرحمہ کا روحانی فیضان ہے جنھوں نے اپنے فرزند جلیل کو دین حق کے فروغ واشاعت کے لیے صحافت کے میدان کارزار میں تنہا نہیں چھوڑ، انہیں مولانا اُسید الحق قادری جیسا محقق اور صاحب نظر عطا کیا، مولانا ذیشان احمد مصباحی جیسا رفیق سفر اور دیگر علم وفکر سے لیس افراد پر مشتمل ایک مضبوط ٹیم دے دی ہے۔ یہ تمام افراد بظاہر ایک ایک فرد کی شکل میں نظر آتے ہیں، مگر ان تمام کی انفرادیت میں اجتماعیت مضمر نظر آتی ہے اور ان شاء اللہ آنے والے وقت میں زمانہ دیکھ لے گا کہ ان میں کا ہر شخص ایک سپاہی نہیں بلکہ مستقل ومکمل ایک فوج (One Man Army) ہے۔ آج ان لوگوں کی نادر علمی وتحقیقاتی تحریروں نے ماہ نامہ جام نور کو ایک علمی، فکری اور تخلیقی درس گاہ بنا دیا ہے۔

زیر نظر شمارے میں تمام مضامین اس قدر دلچسپ، پُر مغز، معیاری ومنفرد ہیں کہ ایک سنجیدہ ذہن قاری کے لیے ان کی درجہ بندی مشکل ہو جاتی ہے۔ حضرت سید محمد اشرف میاں، مولانا مبارک حسین مصباحی، دلشاد احمد قادری، ضیاء الرحمٰن علیمی اور مولانا توقیر رضا خاں صاحب کی تحریریں خوب تر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا محمد احمد مصباحی، مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مفتی نظام الدین رضوی کا مشترکہ مضمون بھی انتشار امت کے حق میں لاریب نسخۂ کیمیا ہے۔ مولانا ذیشان احمد مصباحی نے جس حکیمانہ انداز سے شاہ اسمٰعیل دہلوی کی تاویلات کا محاسبہ کیا ہے اسے دیکھ کر کم از کم اتنا ضروری کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے مضمون کا حق ادا کر دیا۔ حالانکہ یہ کافی پرانا موضوع تھا اور اس پر لکھنے والوں نے کافی کچھ لکھ دیا تھا، لیکن ماشاء اللہ مولانا ذیشان نے اپنے اس قسط وار مضمون میں شاہ اسمٰعیل دہلوی کی فکر ونظر کا نئے انداز سے جائزہ لیا ہے۔ ہم ۲۰ سال سے مولانا عبید اللہ خاں اعظمی کو محض

ایک مقرر اور سیاست داں ہی سمجھ رہے تھے، لیکن الحمد للہ! جام نور میں ان کی اصل فکر ونظر کا آئینہ دیکھا تو ہمیں لگا کہ واقعی وہ ایک مفکر و مدبر بھی ہیں اور قوم کی قیادت کے لائق ہیں، یعنی یہ جام نور کا کمال ہے جس نے ہمارے خیالات ونظریات کو یکسر تبدیل کر دیا- مولانا اسلم نبیل ازہری نے پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی تحقیق پر جس داعیانہ اسلوب میں بحث فرمائی ہے اس کی تعریف کا حق لفظوں سے ہرگز ادا نہیں کیا جا سکتا- انھوں نے جرح وتعدیل جیسے ادق ترین موضوع کو جس علمی گہرائی وگیرائی سے سمجھایا ہے وہ ان کی علمی کمال کا منہ بولتا ثبوت ہے- یہ بھی ہم پر جام نور کا کرم ہے کہ قاہرہ میں موجود ایک صاحب علم کی فکر بلیغ سے ہم گھر بیٹھے محظوظ ہو رہے ہیں- اللہ تعالیٰ آپ اور جام نور کی ادارتی ٹیم اور اس کے معاونین کو سعادت دارین سے نوازے اور جام نور کو ''جامع نور'' بنائے-

نہ جانے حسن ہے یا عشق اتنا جانتے ہیں ہم تجھے کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہائی

سیرت نبوی معاصر دنیا کے لیے رول ماڈل ہے

ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی
جوائنٹ سکریٹری: جامعہ البرکات علی گڑھ (یوپی)

اس دنیا میں پیدا ہونا اور اس دنیا سے چلے جانا یہ قانون قدرت کا عمل ہے، لیکن کچھ شخصیتوں کا پیدا ہونا اور ان کا اس دنیا سے چلا جانا نہ صرف تاریخ میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ ان ایام کو ان شخصیتوں سے منسوب کر کے ان سے خود کو وابستہ کر لے- ۵۷۱ء میں پیغمبر اسلام حضور ﷺ کی پیدائش کو ہم ایک عام پیدائش نہیں تصور کر سکتے، بلکہ اس دن کو ہم سماجی انقلاب اور انسان کی آزادی اور انسانی اقدار کی بہبود کا دن تصور کرتے ہیں- اگر ہم پیغمبر کی زندگی کو کسی تجزیاتی پیمانہ پہ منتقل کریں تب ہم کو یہ اندازہ ہوگا کہ کتنی ہشت پہلو اور کثیر جہات کی حامل وہ ذات تھی جس نے عرب کے ریگ زاروں میں انسانیت، سماجی بہبود، اُخوت ومساوات، عفو ودرگزر، صلہ رحمی، انکساری، امن وآشتی اور بھائی چارہ کے پیغام کو عام کرنے کی نہ صرف سعی کی بلکہ اپنی ذات گرامی سے تا زندگی عمل کر کے لوگوں کو ان تمام کاموں کے لیے رغبت بھی دلائی، مذکورہ بالا اوصاف حمیدہ کا تو تعلق ان انسانی اقدار سے ہے جو کسی بہترین سماج کی تشکیل میں معاون ہیں، لیکن ہمارے پیغمبر نے سماج کو چلانے کے لیے اور دنیا میں رہ کر دنیا کو برتنے اور دنیا کو چلانے کے لیے جو ضروریات ہیں اور سماج اور انسان کی خود کی ترقی کے لیے جو معاملات درکار ہیں ان پر بھی اپنی سیرت مبارکہ کے وہ عکس چھوڑے جن کو آج اس گلوب لائزیشن کے دور میں نافذ کر لیا جائے تو یقیناً موجودہ دنیا کا سیاسی، سماجی، اقتصادی، صنعتی، زراعتی، ثقافتی منظر نامہ ہی مکمل طور پر بدلا ہوا نظر آئے گا- مثلاً اللہ کے رسول نے کم منافع پر بزنس کرنے اور بزنس کے معاملات میں وعدہ وفا کرنے کے حوالے سے اپنی سیرت مبارکہ کے جو عملی نمونے پیش کیے اگر ان کا نفاذ ہم موجودہ دور میں تجارت کے حوالے سے کرنے لگیں تو اس کے موثر اور مثبت اثرات یقیناً دیکھنے کو ملیں گے- ایسے ہی ماحولیات کے تحفظ کے حوالے سے، قدرتی ذرائع کے حوالے سے اگر ہم سیرت مطہرہ کا مطالعہ کریں تو موجودہ دنیا کے سائنس دانوں کو رسول کی سیرت سے حیرت انگیز انکشافات یقیناً حاصل ہوں گے-

آج پوری دنیا میں جو ایجادات ہو رہی ہیں ان کی اہمیت اور ان کے اثرات کو ایک دفعہ قرآن حکیم کی روشنی میں لوگ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، گرچہ ان کا تعلق دین اسلام سے نہیں ہے- آج مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر انگشت بدنداں ہے کہ اسلام اپنے لٹریچر، شخصیتوں کے نام کو مذہبی قوانین کے نفاذ کے حوالے سے بڑی ہی تواتر اور تسلسل کے ساتھ دستاویزی شکل میں پیش کرتا ہے اور شاید یہی بات اس مذہب کے استقلال کے ساتھ قائم رہنے اور صبح قیامت تک اس دین کی حقانیت کی دلیل بننے کے لیے کافی ہے، جس کی عین ضمانت قرآن نے ''ان الدین عنداللہ الاسلام'' کہہ کے دی تھی- آج گلوب لائزیشن اور مادیت کے دور میں پوری دنیا بالخصوص ترقی یافتہ ممالک اور ایک تہائی ممالک جن اقتصادی اور سماجی بحران سے دوچار ہیں اور اپنے تشخص کے لیے ان تمام حربوں کو اپنانے کے درپے ہیں جو انسانیت کے بھی خلاف ہیں اور دنیا کے ظاہری قانون کے بھی، اگر آج لوگ اور حکمراں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے پڑوسیوں سے کیا سلوک ہونا چاہیے اور ایک اچھے حکمراں کے دوسری حکومتوں کے تئیں کیا فرائض متعین ہونا چاہیے، ان تمام تعلیمات کو پیش نظر رکھیں تو یقیناً ان بحران کا بڑی حد تک تدارک ہو سکتا ہے- آج پوری دنیا میں حقوق

انسانی کی لوگ بات کہہ رہے ہیں UNO کو انسانی حقوق کے تحفظ کی سب سے بڑی آماجگاہ تصور کیا جاتا ہے- لیکن اس UNO کی نظروں کے سامنے جب ترقی یافتہ ممالک اپنے سے کمزور حکومتوں اور ملکوں اور ان کے رعایا کو ناجائز طور پر دبا کر استحصال کرتے ہیں تب حقوق انسانی کو محفوظ کرنے کی بات کتنی مضحکہ خیز لگتی ہیں، حقوقِ انسانی کا تحفظ کرنے والے پوری دنیا میں دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اگر بین الاقوامی سطح پر پیغمبر کا آخری خطبہ، خطبہ حجۃ الوداع جو اس دنیا کا پہلا حقوق انسانی چارٹر ہے جس کی ایک ایک سطر سے انسانی تحفظات اور انسانی اقدار کی بحالی کی خوشبوئیں آتی ہیں اگر اس کو سامنے رکھ کر اس کو امپلی منٹ کر کے دنیا کے ممالک اور حکمراں نافذ کریں تو یہ دنیا بھی جنت نظر آئے گی- پیغمبر اسلام نے اگر انسانی حقوق کی بات کی تو اُسے کر کے بھی دکھایا، انھوں نے فرمایا کہ جنگ کے قیدیوں کو مارو نہیں، دشمن کے کھیتوں کو برباد نہ کرو، عورتوں اور بچوں پر تلوار نہ اٹھاؤ، جو تلوار پھینک دے اس پر حملہ نہ کرو- فتح مکہ کے دن پیغمبر ہزاروں مسلمانوں کا لشکر لے کر ایک لمبے عرصے کے بعد جب مکہ میں داخل ہوئے تو وہ مسلمانوں کے لیے بہت ہی حوصلے کا دن تھا اور ان کے لیے ان کے حساب سے رسول اللہ کے دشمنوں سے بدلہ لینے کا دن تھا، ہزاروں مسلمانوں کا لشکر لے کر پیغمبر کا مکہ میں داخل ہونا اور رسول کے چاہنے والوں کا اپنی فتح پر حوصلہ بلند کرنا اور دشمنوں سے بدلہ لینا یہ فطری عمل تھا لیکن جب رسول مکہ میں داخل ہوئے تو سب سے حیرت انگیز اور سبق آموز معاملہ یہ ہے کہ وہ قافلہ میں سب سے آگے ہونے کے بجائے سب سے پیچھے تھے، ان کے چاہنے والے یہی نعرہ بلند کر رہے تھے کہ آج بدلے کا دن ہے لیکن جواب میں پیغمبر اسلام نے اپنے چاہنے والوں کو یہ پیغام دیا کہ آج رحم کا دن ہے آج معافی کا دن ہے-

یہ وہ عملی نمونے ہیں جو ایک سچے قائد کی شان کی عکاسی کرتے ہیں، اسی لیے رسول کو امین وصادق کہا گیا، رحمۃ للعٰلمین کہا گیا، محسن انسانیت کہا گیا، ہادی اعظم کہا گیا، جس کی سیرت کو پڑھنے کے بعد مستشرقین انگشت بدنداں ہیں کہ ایک ہی شخصیت بیک وقت ایک ایسا مذہبی رہنما ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی امت اس کے نام پر جمع ہے اور آج بھی اس کی محبت اور اس کے تئیں عقیدت کو ہی اپنا ایمان کامل تصور کرتے ہیں- وہ اس بات پر حیرت زدہ ہیں کہ وہ رسول دنیا میں رہ کر مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں ان پر مذہبی رنگ بھی غالب ہے ساتھ ہی وہ دنیا اور مذہب میں ایک ایسا تال میل بنائے ہوئے ہیں، جو دنیا کی دیگر ہستیوں میں عنقا ہے- وہ کامیاب باپ بھی ہیں وہ ایک کامیاب سپہ سالار بھی ہیں، وہ ایک کامیاب تاجر بھی ہیں، وہ ایک کامیاب شوہر بھی ہیں، اور اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے لوگوں کو توحید کا سبق پڑھانے کے لیے اور اللہ کا سچا دین اس دنیا میں پھیلانے کے لیے لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں منور کرنے کے لیے - اللہ کے سچے رسول بھی ہیں-

طلب دنیا اور کامن سنس

محمد آصف ریاض
نئی دہلی

آدمی کے دل میں جب کوئی نیکی کا خیال آتا ہے تو شیطان اس کے اوپر حملہ کر دیتا ہے- مثلاً کوئی شخص کسی کو ضرورت مند پاتا ہے تو اس کے دل میں خیر خواہی کا جذبہ ابھرتا ہے، پس وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے، لیکن شیطان اس کے دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اگر وہ اسی طرح اپنے سرمایے کو لٹاتا رہا تو اس کی بیوی، بچے اور اس کے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ شیطان انسان کے سامنے کبھی بیوی، کبھی بچے اور کبھی رشتہ دار کی شکل میں آتا ہے اور اسے فقیری سے ڈرانے لگتا ہے اور بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے-

شیطان انسان کے اندر اور زیادہ اور زیادہ کی طلب پیدا کرتا ہے- وہ انسان کو بتاتا ہے کہ اگر وہ اپنا مال بڑھانے میں ناکام رہا تو بہت جلد مفلس اور قلاش ہو جائے گا- اس کے بچوں اور گھر والوں کی زندگی تباہ ہو جائے گی- شیطان انسان کو یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا کہ اگر وہ زمین کے تمام خزانوں کا مالک بنا بھی دیا گیا تب بھی وہ ان خزانوں کے ساتھ رہنے والا نہیں ہے! شیطان انسان سے وہ چیز بھی چھین لیتا ہے جسے ''کامن سنس'' کہا جاتا ہے- انسان کا کامن سنس بتاتا ہے کہ وہ اس زمین پر ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے- وہ پچاس ساٹھ سال کے اندر اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہے- چنانچہ اسے اپنی محدود زندگی کو سامنے رکھ کر زندگی کا منصوبہ بنانا ہے- اسے لامحدود (Unlimited) کی طلب میں نہیں پڑنا ہے- لیکن شیطان

انسان کو یہ بتا تا ہے کہ اگر وہ لامحدود کے لئے دوڑ بھاگ نہیں کرتا تو اس کے بچے پچھڑ جائیں گے- یہاں بھی شیطان انسان سے اس کا کامن سنس چھین لیتا ہے- اگر انسان اپنے کامن سنس کا استعمال کرے تو وہ پائے گا کہ زمین پر آنے والا ہر بچہ اسپیشل ہے- ہر بچہ اپنے ساتھ ایک دماغ لے کر آتا ہے- اگر اس نے اپنے اس دماغ کا صحیح استعمال کیا تو وہ اپنے باپ سے بڑا امپائر کھڑا کر لے گا اور اگر ایسا نہیں کر سکا تو وہ اس امپائر کو تباہ کر دے گا جو اس کے باپ نے اس کے لئے چھوڑا تھا- اگر بچہ اہل ہوگا تو وہ اپنا ایمپائر خود بنائے گا اور اگر نا اہل ہوا تو پھر اس کے لئے امپائر چھوڑنے کا فائدہ کیا ہے؟ لیکن شیطان انسان کو اور زیادہ اور زیادہ کی طلب میں ڈالتا ہے- وہ انسان کو ہر لحہ فقیری سے ڈراتا رہتا ہے تا کہ انسان خوف میں آکر الٹا سیدھا فیصلہ کرنا شروع کر دے- قرآن کا ارشاد ہے ''الشیطان یعد کم الفقر'' شیطان تمہیں فقیری سے ڈراتا ہے-

شیطان انسان کو یہ بتا تا ہے کہ اگر وہ دنیا کے حصول میں پیچھے رہ گیا تو وہ نا کام ہو جائے گا- حالانکہ اگر انسان نظر اٹھا کر دیکھے اور غور وفکر کرے تو وہ پائے گا کہ جو لوگ دنیا سمیٹ چکے تھے ان کا کیا ہوا؟ وہ تو آج کہیں نظر نہیں آتے؟ کہاں ہیں لال قلعہ کو بسانے والے وہ تو آج خالی ہے؟ اگر انسان اس طرح سوچے گا تو وہ شیطان کے فریب میں آنے سے بچ جائے گا، لیکن شیطان انسان کو اس بات کا موقع ہی نہیں دیتا- وہ انسان کو مس لیڈ کرتا ہے، وہ اسے اور زیادہ کی طلب میں ڈال کر موت کی کھائی میں اتار دیتا ہے، جس کے بعد انسان کے پاس کچھ کرنے کا موقع نہیں بچتا سوائے رونے اور دانت پیسنے کے- قرآن کا ارشاد ہے کہ ''زیادتی کی چاہت نے تمہیں غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے'' - (التکاثر آیت: ۲،۱)

جی ہاں! ملی قیادت صرف ملت کے نام پر ہوسکتی ہے

غلام یحیٰ مصباحی نوری
الجامعۃ المداریہ عربک کالج، اترولہ، بلرام پور (یوپی)

مکرمی مولانا خوشتر نورانی صاحب! سلام مسنون...... ذی الحجہ/محرم ۳۳/۱۴۳۲ھ کا شمارہ جام نور نظر نواز ہوا، پڑھ کر قلبی سکون حاصل ہوا- یقیناً جام نور آپ کی بے مثال صحافت اور اعلیٰ فکر و بصیرت کا آئینہ دار ہے، میدان فکر و قلم سے لے کر درس گاہوں اور خانقاہوں تک کے لیے جام نور ایک ضرورت بن گیا ہے- جماعت اہل سنت کی شیرازہ بندی کی پہل آپ کا مخلصانہ اقدام ہے اور مولانا عبید اللہ خاں اعظمی کا بیان کہ '' آج مسلمانوں کی صحیح ملی قیادت کا فقدان ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ لوگ ملی قیادت کے نام پر مسلک کا فروغ چاہتے ہیں یا ذاتی اغراض کی تکمیل چاہتے ہیں جبکہ ملی قیادت صرف ملت کے نام پر ملی اغراض کے تحت ہی ہوسکتی ہے-'' اسی طرح دیگر عنوانات و کالمز سے مزین جام نور اپنی مثال آپ ہے، لیکن محرم کے شمارے میں خصوصی طور پر تاجدار کربلا و مناقب اہل بیت پر ایک اچھی تحریر ضرور شامل کرنا چاہیے تھا، افسوس تذکرۂ اہل بیت سے اس مرتبہ جام نور خالی رہا-

عشق رسول اطاعت رسول کا تقاضا کرتی ہے

کامران غنی
ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ایمان دراصل عشق کی اعلی ترین منزل ہے- یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنا وجود تک بھول جاتا ہے- محبوب کی رضا، اور اُس کی خوشنودی کے لیے وہ ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرنے کی نہ صرف قوت رکھتا ہے بلکہ ان صعوبتوں میں بھی اسے لذت و سرور حاصل ہوتا ہے- عشق وہ جذبہ ہے جو دنیا کی تمام آسائشوں سے بے نیاز کر کے صرف اور صرف وصال محبوب اور رضائے محبوب کی تڑپ پیدا کرتا ہے- دین کی ساری عمارتیں بھی عشق کے انھیں لافانی جذبات پر قائم ہیں- اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہی دراصل ایمان ہے- قرآن کی متعدد آیات اور بے شمار احادیث مبارکہ نہ صرف محبت خدا و رسول پر دلالت کرتی ہیں بلکہ یہ پیغام بھی دیتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے بغیر ہمارا کوئی بھی عمل قابل قبول نہیں- چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآءُ كُمْ وَ اَبْنَآءُ كُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَا رَةٌ تَخْشَوْنَ

كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ- وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ-(التوبہ:۲۴)

(اے نبی! کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں، اور تمہارے عزیز وا قارب، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ گھر جو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا-)

نیز فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ- وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ-(آل عمران:۳۱)

(کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا-اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے-)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ- وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا-(النسآء:۸۰)

(جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی- اور جو منھ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمھیں اُن لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے-)

اسی طرح متعدد حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ایمان کا لازمی جز قرار دیا گیا ہے- بخاری و مسلم کی مشہور حدیث ہے:

”لا یؤ من احد کم حتی اکون احب الیه من والده و ولده والناس اجمعین-“ (تم میں سے کوئی ایمان میں اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری محبت اس کے دل میں اس کے باپ، بیٹے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر راسخ نہ ہو جائے-)

قرآن کریم کی ان آیات اور احادیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کا لازمی جز ہے- روایتوں میں مذکور ہے کہ اسلام کی سیاسی طاقت بڑھ جانے کے بعد مدینہ کے بہت سے اعراب (دیہاتی) دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور اسلامی احکامات کی پابندی بھی کرنے لگے لیکن ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اب تک راسخ نہیں ہو سکی تھی، انھوں نے بعض مواقع پر اپنے ایمان لانے کا اس طرح دعویٰ کیا گویا انھوں نے ایمان لا کر اللہ کے رسول ﷺ پر کوئی احسان کر دیا ہو چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بذریعۂ وحی ان کے ایمان کی حقیقت واضح کر دی:

”اور یہ اعرابی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو- البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی، ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر داخل نہیں ہوا ہے-“ (سورۃ الحجرات)

اس آیت مبارکہ نے واضح کر دیا کہ محض اطاعت یعنی ظاہر رسوم و قیود ہی دائرۂ ایمان میں آنے کے لیے کافی نہیں بلکہ ایمان کا تعلق براہِ راست قلب و نظر سے ہے اور ایمان کی حقیقی لذت تب تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے دلوں میں جذبۂ عشق راسخ نہ ہو جائے- یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ اطاعت سے محبت نہیں ہوتی بلکہ محبت اطاعت واتباع پر مجبور کرتی ہے- محبوب کی محبت میں محبّ سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب محبّ جان دے کر بھی یہ تصور کرتا ہے کہ اس نے حق بندگی ادا نہیں کیا- یہی وہ مقام ہے جہاں محبت آزمائی جاتی ہے ؎

کاش خوباں ہمہ از عاشق خود جاں طلبند تا بہر بولہوسے عاشقی آساں نہ شود

صحابہ کرام کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اسی انتہا کو پہنچ چکی تھی- یہی وجہ ہے کہ بڑی سے بڑی باطل طاقتیں بھی انھیں سرنگوں نہ کر سکیں- اللہ کے رسول ﷺ سے سچی محبت نے ان کے دلوں میں ایثار، وفا، خلوص، خاکساری، خلق خدا سے محبت جیسے عظیم جوہر پیدا کر دیے تھے- آج ہم محبت رسول ﷺ کا دم بھرتے ہیں لیکن محبت کے تقاضوں کو ہم نے فراموش کر دیا- جس رسول ﷺ نے ہمیں محبت واخوت اور بھائی چارگی کا درس دیا اس رسول ﷺ کے پیغام کو ہم نے صرف اپنی تحریر وتقریر کی زینت بنا کر چھوڑ دیا- جس رسول ﷺ نے ہمیں متحد کرنے کے لیے صعوبتیں اٹھائیں اس رسول ﷺ سے ہم نے صرف زبانی محبت کے ہی دعوے کیے، ہم نے ایک جگہ رہتے ہوئے بھی اپنی علیحدہ عمارتیں تعمیر کر

لیں-ہم متحد ہوکر اپنے نبی ﷺ کے پیغام کو ساری دنیا میں کیا پہنچاتے ہم نے آپس میں ہی اختلاف وانتشار پیدا کر لیے-اگر ہمارے دلوں میں اللہ کے رسول ﷺ کی سچی محبت جاگزیں ہوتی تو نظریاتی اختلافات کے باوجود ہم متحد ہوتے-

اللہ کا شکر واحسان ہے کہ ہم محمد ﷺ کے امتی ہیں-ہمارے دلوں میں ان کی محبت بھی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ محبت کی اس جذبے کو مزید بڑھایا جائے-محبت رسول ﷺ تمام محبتوں پر غالب آجائے-اگر ہمارے دلوں میں اللہ کے رسول ﷺ سے سچی محبت پیدا ہوگئی تو پھر اللہ کی نظر عنایت والتفات بھی ہم پر ہوگی اور محبت رسول ﷺ کے طفیل ہماری کوتاہیاں بھی درگزر کر دی جائیں گی (ان شاء اللہ) اور ہمارا شمار بھی اللہ کے مقرب بندوں میں ہوگا-

اپنوں کی ستم ظریفیاں اور علامہ فضل حق خیر آبادی چشتی

نورین علی حق
شوگر ہاسپٹل، چمیلیان روڈ، باڑہ ہندوراؤ، دہلی

آج ہر طرف شور ہے کہ حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کی شخصیت اور خدمات کو فراموش کر دیا گیا ہے اور اس کی بازیافت کی کوششوں میں ہم مصروف ہیں، لیکن ایسے ماٰخذ کی کمی ہے جن کے ذریعے ان پر گفتگو آگے بڑھائی جا سکے-ان کے مجاہدانہ کردار کو ہم نے ۱۹۴۷ کے بعد پیش کیا، ایسے میں آج ان کرم فرماؤں کی کمی نہیں جو سرے سے علامہ کے مجاہدانہ کردار سے انکار کرتے ہیں، گوکہ علامہ کی ہمہ جہت شخصیت ناقابل فراموش ہے-

حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷ء/۱۸۶۱ء) ایک مردم خیز خانوادہ میں پیدا ہوئے، اعلی تعلیم حاصل کی، منطق وفلسفہ کی دنیا میں اتھاریٹی تسلیم کیے گئے، تصانیف چھوڑیں، بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہندستان کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی جان توڑ محنت کی، عشق ومحبت رسول ﷺ پر کتابیں لکھیں، قوانین سازی کی-میں سوچتا ہوں کہ ان تمام مضبوط اور توانا امور کی انجام دہی کے باوجود انہیں پردۂ خفا میں کیوں ڈال دیا گیا اور ایک جاہل، ان پڑھ شخص کو ہمارے علما بھی مولانا کے لقب کے ساتھ کیوں ملقب کرنے لگے تو جواب ملتا ہے کہ ڈیڑھ صدی تک ہمارے علما غیروں اور فضل حق مخالفین کو ہی پڑھتے رہے، جس کے نتیجے میں ہمارے بزرگان دین اور علمائے کرام طاق نسیاں کی زینت بن کر رہ گئے-

آپ یاد کریں حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸ رمضان ۱۲۴۰ھ/۱۹۲۵ء میں مسئلہ امکان نظیر اور مسئلہ شفاعت پر شاہ اسماعیل کی کتاب 'تقویۃ الایمان'' کے خلاف فتوی کفر دیا جو ''تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے-۱۸۲۵ء سے ۲۰۱۱ء تک ہمارے علما تقویۃ الایمان کے رد وابطال سے تھکے نہیں ہیں اور مسلسل اس کے ابطال کا سلسلہ جاری ہے، حالاں کہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ علامہ نے فیصلہ کر دیا تھا، اب ہم آگے بڑھتے، ان کی تصانیف کی اشاعت کا کام کرتے لیکن صد حیف ایسا نہ ہو سکا-

تاریخی حقائق کے سہارے آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ فضل حق خیرآبادی پر ایک صدی تک کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا-مولانا عبداللہ بلگرامی، مولانا برکات احمد ٹونکی، مولانا عبدالحکیم شرف قادری، مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی، حکیم محمود احمد برکاتی کا وقیع کام خیرآبادیات پر ہے جو لائق مستحسن قدم تو ہے لیکن تحریک کے طور پر علامہ فضل حق کی شخصیت، علم وفضل سوانح اور مجاہدانہ زندگی کو اختیار کرنے کی طرف جس نے ہمیں متوجہ کیا وہ مولانا یٰسین اختر مصباحی ہیں-

اس سلسلے میں مولانا یٰسین اختر مصباحی، ڈاکٹر سلمہ سیہول، ڈاکٹر معین الدین عقیل، اور اسکالرز میں ڈاکٹر قمر النسا بیگم، ڈاکٹر محمد عبدالستار خاں، ڈاکٹر عبدالواحد چشتی، ڈاکٹر عوض اللہ جاد الحجازی، ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، ڈاکٹر جہاں آرا بیگم، قابل ذکر اور لائق صد ستائش ہیں جنہوں نے مختلف ناحیوں سے علامہ پر کام کیا اور خیرآبادیات کو آگے بڑھانے میں ممد ومعاون ثابت ہوئے-ان کے علاوہ مولانا اسید الحق محمد عاصم القادری اور مولانا خوشتر نورانی کی بالترتیب ''خیرآبادیات'' اور ''علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات'' کے نام سے کتابیں آچکی ہیں، دونوں معاصر محقق و ناقد نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے خیرآبادیات کے بکھرے اوراق کو سمیٹا ہے، جس کے نتیجے میں علامہ کا ڈیڑھ سو سالہ یوم وفات یادگار بن گیا ہے اور یہ سلسلہ دراز ہے-اب بھی سمینار وسمپوزیم اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہے-

(بقیہ صفحہ 26 پر ملاحظہ کریں)

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی☆

مسائل اور الجھنیں

قارئین جام نور اس کالم میں دینی، علمی، فکری، ادبی، تعلیمی، سائنسی، سیاسی اور سماجی مسائل سے متعلق اپنے سوالات/الجھنوں کا جواب/حل حاصل کر سکتے ہیں- اس کے لیے قارئین اپنے سوالات مختصر لفظوں میں لکھ کر ادارے کے پتے پر ارسال کریں- (ادارہ)

ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعے رویت ہلال کا ثبوت

''ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں'' اور'' زمانے کے بدلنے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں'' یہ علمائے اصول فقہ کے مسلمہ اصول ہیں جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں- جدید ذرائع ابلاغ نے جب سے قدم رکھا ہے دنیا کو ایک گاؤں بنا دیا ہے- اس نے بے شمار مشکلیں حل کی ہیں تو بے انتہا مسائل بھی پیدا کیے ہیں- انہیں مسائل میں سے جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کا مسئلہ بھی ہے- اس حوالے سے جام نور نے دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں ''جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کا ثبوت: ایک علمی وفکری جائزہ'' کے عنوان سے ایک ادارتی تحریر پیش کی تھی جو ارباب فقہ وفتاویٰ کی بارگاہ میں ایک سائل کا سوال اور کئی جہتوں سے مفتیان شرع متین کی توجہات کی طالب تھی- پیش نظر تحریر اہل سنت کے وسیع نظر مفتی حضرت مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی کی ہے جو ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعے رویت ہلال کے ثبوت میں وارد ہونے والے شبہات واعتراضات کا بلیغ علمی ازالہ کرتی ہے- ہمیں امید ہے کہ یہ تحریر جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کے ثبوت کے باب میں ایک موثر پیش رفت ثابت ہوگی- (ادارہ)

سوال: ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعہ استفاضۂ خبر کا تحقق ہو کر رمضان وغیرہ کے چاند کا ثبوت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: کسی شہر سے ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعے نہیں خود آ کر بھی کچھ لوگ یہ گواہی دیں کہ وہاں لوگوں نے چاند دیکھا ہے، یا فلاں سنّی صحیح العقیدہ متدیّن عالم دین نے لوگوں کو روزہ رکھنے یا عید کرنے کے لیے کہا ہے تو بھی وہ استفاضہ جو شرعاً حجت ہے، متحقق نہیں ہوگا-

فتح القدیر ج ۲/ص ۲۴۳، پھر اس کے حوالے سے تنبیہ الغافل والوسنان ص ۲۵۲ میں ہے:

لو شهد جماعة ان اهل بلد كذا رأوا هلال رمضان قبلكم بيوم فصاموا وهذا اليوم ثلاثون بحسابهم ولم يرهٰؤلاء الهلال لايباح لهم فطرغد ولا تترك التراويح هٰذه الليلة لان هٰذه الجماعة لم يشهدوا بالروية ولا على شهادة غيرهم وانما حكوا روية غيرهم-

ایک جماعت یہ گواہی دے کہ فلاں شہر کے لوگوں نے ایک دن پہلے رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھا تھا جس کے حساب سے آج رمضان کی تیسویں تاریخ ہے، لیکن آج یہاں چاند دیکھا نہیں گیا تو آج کی رات تراویح چھوڑ دینا جائز ہے نہ اس بنا پر کل عید کرنا جائز- کیونکہ اس جماعت نے اپنے دیکھنے کی گواہی دی نہ دیکھنے والوں کی گواہی پر گواہی دی بلکہ دوسروں کے دیکھنے کو بیان کیا-

علامہ شامی نے ردالمحتار ج ۳/ص ۳۵۹ میں بھی فتح القدیر کے حوالے سے یہی عبارت نقل کر کے فرمایا:

قلت: وكذا...... ان قاضى تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حكاية لفعل القاضى ايضاً وليس بحجة-

میں کہتا ہوں: اسی طرح اگر یہ گواہی دے کہ فلاں شہر کے قاضی نے لوگوں کو رمضان کے روزہ رکھنے کے لیے کہا ہے تو بھی گواہی نہیں مانی جائے گی کیونکہ یہ کہنا بھی قاضی کے فعل کی حکایت ہے اور قاضی کا فعل دلیل شرعی نہیں-

ہاں! (الف) جس شہر میں لوگ سنّی صحیح العقیدہ عالم دین کے فیصلے پر ہی روزہ وعید کرتے ہیں، اس شہر سے اتنے زیادہ لوگ خود آ کر خبر دیں کہ یہاں سنّی حضرات نے بر بنائے رویت روزہ رکھا ہے یا عید کر رہے ہیں بلکہ احتیاطاً اپنی طرف سے بھی ان نمبروں پر فون کر کے مزید اطمینان کر لیا جائے کہ انھیں لوگوں نے ٹیلی فون اور موبائل پر خبر دی ہے- اسی طرح دوسرے معلوم نمبروں پر بھی فون کر کے تصدیق حاصل

☆Jamia Qadria Mazharul Uloom,Ali Pur,Kalia Chak,Distt.Malda(W.Bangal)

کرلی جائے جس سے چاند ہوجانے کا ظن غالب ملحق بہ یقین ہوجائے، تو اس استفاضۂ خبر کا تحقق ہوجائے گا جو شرعاً حجت ہے- کیونکہ استفاضۂ خبر سے یہی مقصود ہے-

فتاویٰ رضویہ ج ۴ص ۵۵۲ تا ۵۵۳ مترجم ج ۱۰/ص ۴۱۵، ۴۱۶ تا ۴۱۷ میں ہے: جس اسلامی شہر میں...... قاضی شرع نہیں، تو مفتی اسلام مرجع عوام ومتبع الاحکام ہو کہ احکام روزہ عیدین اسی کے فتوے سے نفاذ پاتے ہیں...... وہاں سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب بیک زبان اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بر بنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی...... یہ خبر اگرچہ نہ خود اپنی رویت کی شہادت ہے نہ کسی شہادت پر شہادت، نہ بالتصریح قضائے قاضی پر شہادت، نہ کتاب قاضی پر شہادت، مگر اس مستفیض خبر سے بالیقین یا بہ غلبۂ ظن ملحق بالیقین وہاں رویت وصوم وعید کا ہونا ثابت ہوگا اور جب کہ وہ شہر اسلامی اور احکام حکام کی وہاں پابندی دوامی ہے، تو مظنون ہوگا کہ امر بحکم واقع ہوا، تو اس طریقہ سے قضائے قاضی کہ حجت شرعیہ ہے (ضمناً) ثابت ہوجائے گی-

ردالمحتار میں ہے: **هٰذه الاستفاضة ليس فيها شهادة على قضاء قاض ولا على شهادة لكن لما كان بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا يوم كذا لزم العمل بها لان البلدة لا تخلوعن حاكم شرعى عادة فلابد من ان يكون صومهم مبنيّا على حكم حاكمهم الشرعى فكانت تلك الاستفاضة بعمنى نقل الحكم المذكور-**

اسی میں ہے: **قال الرحمتى معنى الاستفاضة ان تاتى من تلك البلدة جماعات متعددون كل منهم يخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن روية، لامجردالشيوع الخ**

تنبیہ الغافل والوسنان میں ہے: **لما كانت الاستفاضة بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا يوم كذالزم العمل بها لان المراد بلدة فيها حاكم شرعى كما هو العادة فى البلاد الاسلاميه فلا بدان يكون خبرهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعى فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحكم المذكور......**

دربارۂ استفاضہ یہ تحقیق علامہ شامی کی ہے اور اس تقدیر پر وہ شرائط ضرور ہیں کہ صوم وعید بر بنائے حکم حاکم شرع عالم متبع احکام ہوا کرتا ہو-

(ب) اسی طرح سنّی صحیح العقیدہ متدیّن عالم دین کے ثبوت ہلال کا فیصلہ کرنے کی خبر دیں تو اس استفاضے کا تحقق ہوجائے گا جو شرعاً حجت ہے-

فتح القدیر ج ۲/ص ۲۴۳، پھر بحرالرائق ج ۲/ص ۲۷۰، اور تنبیہ الغافل والوسنان للعلامۃ الشامی ص ۲۵۲ میں ہے:

ولو شهدوا ان قاضى بلدة كذا شهدعنده اثنان برؤية الهلال فى ليلة كذا وقضى بشهادتهما جاز لهٰذا القاضى ان يحكم بشهادتهما لان قضاء القاضى حجة وقد شهدوا به انتهى-

اگر یہ گواہی دے کہ قاضی کے پاس دو آدمیوں نے فلاں رات چاند دیکھنے کی گواہی دی اور قاضی نے ان کی گواہی پر چاند ہوجانے کا فیصلہ کردیا تو اب مان لیا جائے گا کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلیل شرعی ہے اور جماعت نے اسی کی گواہی دی-

فتاویٰ رضویہ مترجم ج ۱۰ ار کے ص ۳۷۹ میں ہے:

جس شہر میں قاضیٔ شرع ہو اور اسی کے حکم سے وہاں روزہ وعید ہوا کرتے ہوں، وہاں سے لوگ گروہ کے گروہ آئیں اور بالاتفاق اس حاکم شرع کا حکم بیان کریں، (تو استفاضۂ شرعی متحقق ہوجائے گا اور قضائے قاضی کہ حجت شرعیہ ہے صراحۃً ثابت ہوجائے گی)

(ج) یونہی یہ بتائیں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ اپنی آنکھ سے چاند دیکھنا بیان کرتے تھے، تو بھی استفاضۂ شرعی متحقق ہوگا-

فتاویٰ رضویہ ہی میں ہے :اور ایک صورت یہ بھی متصور کہ دوسرے شہر سے جماعات کثیرہ آئیں اور سب بالاتفاق بیان کریں کہ وہاں ہمارے سامنے لوگ اپنی آنکھ سے چاند دیکھنا بیان کرتے تھے جن کا بیان مورث یقین شرعی تھا- ظاہراً اس تقدیر پر وہاں کسی حاکم شرع کا ہونا ضروری نہیں کہ رویت فی نفسہا حجت شرعیہ ہے- (۴۱۷)

(د) ایسے ہی اپنی رویت کی خبر دیں، تو بھی استفاضۂ شرعی کا تحقق ہوجائے گا کیونکہ جب دوسروں کے تعلق سے یہ کہنے پر کہ وہاں لوگ اپنی آنکھوں سے چاند دیکھنا بیان کرتے تھے، استفاضۂ شرعی کا تحقق ہوجاتا ہے تو اپنے بارے میں یہ کہنے سے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے چاند

دیکھا ہے، بدرجۂ اولیٰ استفاضۂ شرعی کا تحقق ہو جائے گا-

شبہ: اعلیٰ حضرت نے تار کی خبر سے استفاضۂ شرعی کا تحقق تسلیم نہیں کیا ہے، تو ٹیلی فون اور موبائل سے کیسے تحقق ہو جائے گا؟

ازالۂ شبہ: اعلیٰ حضرت نے تار سے استفاضۂ شرعی کا تحقق نہ ہونے کی وجہیں یہ بیان کی ہیں:

(الف) جو چاہے تار گھر میں جائے اور جس کے نام سے چاہے تار دے آئے، وہاں نام اور نسب کی کوئی تحقیقات نہیں ہوتی - بالفرض اگر اصل خبر میں کوئی خلل شرعی نہ ہوتا ہم اس کا جامۂ اعتبار تار میں آ کر یکسر تار تار، کہ وہ بیان ہم تک اصالۃً نہ پہنچا بلکہ نقل در نقل ہو کر آیا- (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰/ص ۳۶۳)

(ب) نہ یہاں حد تواتر تک پہنچنا معقول کہ دس نہیں ہزار جگہ سے تار آئیں، ہم کو تو ایک ہی تار گھر سے ملیں گے اور کہیں دو چار بھی ہوئے تو یہ تواتر نہیں-(۳۶۹)

(ج) یہاں اگر متعدد جگہ سے خط یا تار آئے بھی تو اولاً وہ ان وجوہ ناجوازی سے جنھیں ہم نے فتویٰ میں مفصلاً ذکر کیا، ہرگز بیان مقبول کے سلسلے میں نہیں آ سکتے- ڈاک کے منشی، تار کے بابو، چٹھی رساں اکثر کفار یا عموماً مجاہیل یا فساق فجار ہوتے ہیں اور بفرض باطل آئیں بھی تو یہ تعدد مخبر عنہ میں ہوا نہ کہ مخبرین میں کہ یہاں تار لینے والے بابو اگر مسلمان ثقہ ہوں بھی تو ہرگز اتنی جماعت متعددہ نہ ہوں گی جن کی اخبار پر یقین شرعی حاصل ہو، بلکہ عامۂ بلاد میں صرف دو ایک ہی تار گھر ہوتے اور صدر ڈاک خانہ تو ایک ہی ہوتا ہے اگر چہ بڑے شہر میں تقسیم کے لیے دو چار برانچ اور بھی ہوں-(۴۲۷)

اور ظاہر ہے کہ سطور بالا میں موبائل اور جن ٹیلی فونوں کا اور جس طرح ان سے ملی ہوئی خبروں پر اطمینان و تصدیق کا تذکرہ ہوا، ان میں تار کے تعلق سے بیان شدہ وجوہ ناجوازی نہیں پائی جاتی ہیں- موبائل اور ان ٹیلی فون سے خبر نہ تو نقل در نقل ہو کر آتی ہے اور نہ ہی ایک ہی واسطہ سے ہم تک پہنچتی ہے-

شبہ: اعلیٰ حضرت نے ٹیلی فون کی خبر کو بھی امور شرعیہ میں نامعتبر قرار دیا ہے تو اس سے استفاضۂ شرعیہ کا تحقق کیسے ہو جائے گا؟

ازالۂ شبہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے زمانہ کو تو سو سال ہو گئے، آج سے تیس پینتیس سال پہلے بھی ٹیلی فون سے خبر کی یہ صورت نہیں تھی جو صورت آج ہے- اس وقت ٹیلی فون سے بات کرنے کے لیے پہلے مقامی ایکسچینج میں کال بک کرانی پڑتی تھی، پھر مقامی ایکسچینج دوسرے ایکسچینج سے رابطہ کرتے تھے، اس کے بعد وہ ایکسچینج اس ٹیلی فون سے رابطہ کرنے کے بعد بطرز معکوس ٹیلی فون کرنے والے سے بات کراتے تھے جس میں بسا اوقات گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا اور اب ٹیلی فون ہو یا موبائل، ان سے بات کرنے کے لیے ان واسطوں کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی ہے- آپ جن سے بات کر رہے ہوتے ہیں ان کا نمبر آپ کی نگاہ میں اور جو آپ سے بات کر رہا ہوتا ہے آپ کا نمبر ان کے سامنے ہوتا ہے بلکہ دونوں جانب تھری جی (3G) موبائل ہو تو آپ ان کو اور وہ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے-

دوسری بات یہ کہ اعلیٰ حضرت نے ٹیلی فون کے ذریعہ بیان کو استفاضۂ خبر کے تعلق سے نامعتبر نہیں قرار دیا تھا، بلکہ شہادت کے تعلق سے نامعتبر قرار دیا تھا، وہ بھی اس صورت میں جبکہ دونوں دو بدو نہ ہوں اور دو بدو ہوں تو شہادت کے باب میں بھی معتبر قرار دیا تھا-

فتاویٰ رضویہ مترجم ج ۱۰/ص ۳۶۷ میں ہے:

تار کی حالت ٹیلی فون درکنار، خط سے بھی بہت گری ہے......اور علما تصریح فرماتے ہیں کہ خط بھی معتبر نہیں......تو شرعاً تار پر عمل کیوں کر ممکن! یونہی ٹیلی فون کہ اس میں شاہد و مشہود نہیں ہوتا صرف آواز سنائی دیتی ہے-

اسی میں ص ۳۷۰ پر ہے: ٹیلی فون دینے والا اگر سننے والے کے پیش نظر نہ ہو تو امور شرعیہ میں اس کا کچھ اعتبار نہیں اگر چہ آواز پہچانی جائے کہ آواز آواز کے مشابہ ہوتی ہے- اگر وہ شہادت دے معتبر نہ ہوگی-...... ہاں! اگر وہ اس کے پیش نظر ہے جسے دو بدو، آمنے سامنے سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی اس کی دونوں آنکھیں اس کی دونوں آنکھوں کے سامنے ہوں، ایک دوسرے کو دیکھ رہا ہو اور ٹیلی فون کا واسطہ صرف بوجہ آواز رسانی کے لیے ہو کہ اتنی دور سے آواز پہنچنا دشوار تھا، تو اس صورت میں اس کی بات جس حد تک شرعاً معتبر ہوتی اب بھی ہوگی- مثلاً خود اپنی رویت کی شہادت ادا کرے تو مانی جائے گی اگر وہ مقبول الشہادت ہے-

شبہ: شامی میں علامہ رحمتی کے حوالہ سے استفاضہ کی جو تعریف کی گئی ہے، اس میں "ان تاتی من تلک البلدة" کے الفاظ ہیں،

جبکہ موبائل اور ٹیلی فون کی خبروں میں خبر دینے والا آتا نہیں ہے، تو ٹیلی فون کی خبروں پر استفاضۂ خبر کی تعریف کیسے صادق آئے گی؟

ازالۂ شبہ: استفاضہ تو بعد کی چیز ہے، اس زمانہ میں مطلق خبر کے بھی حصول کی کوئی صورت ''آئے، گئے'' بغیر ممکن نہیں تھی، اس لیے علامہ رحمتی کی عبارت میں ''آنے'' کی بات ان کے زمانے کے اعتبار سے ایک امر واقعی تھی، احترازی نہیں کہ اس کے بغیر استفاضہ کا تحقق ہی نہ ہو- اگر ''آنے'' کی قید احترازی ہوتی اور ''آنا'' ضروری ہوتا تو تار کی خبر سے استفاضہ نہ ہونے سے متعلق اعلیٰ حضرت کو سطروں کی سطریں روشن فرمانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ تار میں خبر دینے والا ''آتا'' نہیں ہے، اس لیے اس سے استفاضہ نہیں ہوسکتا- علاوہ ازیں مطلع صاف ہونے کی صورت میں فقہائے کرام جمع عظیم کی رویت ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن جمع عظیم کا اطلاق کتنے افراد پر ہوگا؟ اس سلسلہ میں امام محمد علیہ الرحمۃ سے روایت ہے کہ قاضی کو جتنے لوگوں کے بیان پر اعتماد ہو جائے- صاحب بحر الرائق نے اسی کو حق کہا ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت یہی نقل کی ہے اور فرمایا ہے کہ ہر طرف سے مسلسل خبر آئے، یہ نہیں فرمایا ہے کہ لوگ آکر خبر دیں-

چنانچہ تنبیہ الوسنان ص ۲۳۴ر میں ہے:

واذالم یکن فی السماء علة اشترط لهلال رمضان والفطر جمع عظیم یقع العلم الشرعی وهو غلبة الظن بخبرهم......... هٰذا ظاهر الروایة ولم یقدر فیها الجمع العظیم بشئ...... وعن محمد تفویضه الی رائ الامام قال فی البحر والحق ماروئ عن محمد وابی یوسف ایضا ان العبرة لتواتر الخبر ومجیئه من کل جانب انتهی وذکر الشرنبلالی وغیره تبعا للمواهب ان الاصح روایة تفویضه الی رائ الامام-

مطلع صاف ہو تو رمضان کا چاند ہو یا عید کا چاند، سب کے ثبوت کے لیے اتنی بڑی جماعت کا دیکھنا شرط ہے، جس کی خبر سے علم شرعی یعنی ظن غالب ہو جائے- جماعت میں کتنے لوگ ہوں؟ ظاہر الروایۃ میں تعداد متعین نہیں کی گئی ہے- امام محمد سے مروی ہے کہ قاضی کو ظن غالب جتنے لوگوں کی باتوں سے ہو جائے- بحر الرائق میں ہے کہ حق وہی ہے جو امام محمد اور امام ابو یوسف سے بھی مروی ہے یعنی ہر جانب سے مسلسل خبر آئے- شرنبلالی نے مواہب کی اتباع میں قاضی کے ظن غالب ہی کو زیادہ صحیح ٹھہرایا ہے-

بحر الرائق ج ۲/ص ۲۶۹ میں ہے: **وعن محمد استکثره الحاکم فهو کثیر وما استقله فهو قلیل-**

امام محمد سے مروی ہے کہ قاضی جس جماعت کو بڑی جماعت سمجھے وہ بڑی جماعت ہے اور جس جماعت کو چھوٹی سمجھے وہ چھوٹی جماعت-

شبہ: علامہ شامی نے رد المحتار میں استفاضہ کی تعریف علامہ رحمتی کے حوالہ سے ان لفظوں میں نقل کی ہے ''**جماعات متعددون**'' جن کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے ''گروہ در گروہ'' کے الفاظ سے کیا ہے جبکہ موبائل اور ٹیلی فون میں جماعت یا گروہ کا تصور ہی نہیں ہوسکتا تو اس سے استفاضۂ شرعی کا تحقق کیسے ہو جائے گا؟

ازالۂ شبہ: خود علامہ شامی نے **منحة الخالق** میں استفاضہ کی جو تعریف کی ہے اس میں ''**جماعات متعددون**'' کے بجائے ''**الواردین**'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں- چنانچہ فرماتے ہیں:

اعلم ان المراد بالاستفاضة تواتر الخبر من الواردین من بلدة الثبوت الی بلدة التی لم یثبت بها، لا مجرد الاستفاضة لانها قدتکون مبنیة علی اخبار رجل واحد مثلاً فیشیع الخبر عنه ولا شک ان هٰذا لا یکفی بدلیل قولهم اذا استفاض الخبر وتحقق فان التحقق لایکون الا بماذکرنا-

استفاضہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ خبر صرف مشہور ہو جائے، بلکہ جس شہر میں چاند کا ثبوت ہو گیا ہے، اس شہر سے آنے والوں کے ذریعہ لگاتار خبر موصول ہو-

تو معلوم ہوا کہ ''جماعت ہو'' یا ''گروہ'' اس سے مقصود یہ ہے کہ مخبرین اتنی تعداد میں ہوں کہ ان کی خبروں سے ظن غالب ہو جائے اور یہ مقصود مخبرین کی اتنی تعداد جن پر ''جماعات متعددہ'' اور ''گروہ در گروہ'' صادق آئے، کے بغیر ممکن نہیں- یہ مقصود نہیں ہے کہ مخبرین آئیں یا سارے مخبرین ایک ساتھ ہی خبر دیں، لہٰذا ٹیلی فون اور موبائل پر اتنے لوگ خبر دیں جن پر جماعات متعددہ اور گروہ در گروہ صادق آئے اور قاضی کو ظن غالب ملتحق بالیقین ہو جائے تو اس استفاضہ کا تحقق ہو جائے گا جو شرعاً حجت ہے- فقیر محمد مطیع الرحمن رضوی عفرلہ

روبــــرو

"دہلی یونیورسٹی" کے سابق صدر شعبہ اردو اور اردو کے معروف نقاد

محترم جناب **پروفیسر عتیق اللہ** سے ملاقات

پروفیسر سید عتیق اللہ (پ:۲ جولائی ۱۹۴۲ء) اردو علمی دنیا کا ایک متعارف نام ہے-موصوف نامور ادیب، شاعر، ناقد اور محقق ہیں-ابتدائی تعلیم کے بعد وکرم یونی ورسٹی اجین سے ۱۹۶۹ء میں ایم اے انگلش اور ۱۹۷۱ء میں ایم اے اردو کیا- پھر "جدیدیت اور اردو نظم" کے عنوان پر ۱۹۷۶ء میں مراٹھواڑا یونیورسٹی اورنگ آباد سے پی ایچ ڈی کی-اسی یونی ورسٹی کے مولانا آزاد کالج میں ۶۷-۱۹۷۲ء تک لیکچرر رہے- پھر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں ۸۴-۱۹۷۸ء لیکچرر، ۹۴-۱۹۸۴ء ریڈر اور ۲۰۰۵ء-۱۹۹۴ تک پروفیسر رہے-اس بیچ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۲ء تک صدر شعبہ بھی رہے-۷-۲۰۰۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ اردو میں وزیٹنگ پروفیسر رہے-موصوف کی کئی کتابیں اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں جن میں قدر شناسی، تنقید کا نیا محاورہ، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، خواتین اردو ادب وغیرہ خاصی اہم ہیں- دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، اتر پردیش اردو اکیڈمی، بنگال اردو اکیڈمی، دہلی اردو اکیڈمی، راجستھان اردو اکیڈمی اور حکومت مدھیہ پردیش نے موصوف کی خدمات کے اعتراف میں متعدد ایوارڈز اور اعزازات سے نوازا-موصوف ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک سہ ماہی غبار خاطر اورنگ آباد اور ۱۹۷۸ء میں سہ ماہی تناظر دہلی کے ایڈیٹر رہے-اسی طرح سہ ماہی گفتگو ممبئی کے خصوصی نمبر ۱۹۸۱ء اور عصری آگہی دہلی کے خصوصی شمارے ۱۹۸۲ء کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر رہے-موصوف کی علمی و ادبی فتوحات کا سلسلہ ابھی دراز ہے-ان کے تازہ انٹرویو کے خاص اقتباسات آپ کے سامنے ہیں ———— **خوشتر نورانی**

جام نور: سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ ادب کیا ہے؟

پروفیسر عتیق اللہ: "ادب" ایک اہم اصطلاح ہے، جس کے مختلف پہلو ہیں- اس طرح کی اصطلاحات کو ایک جملے میں نہیں بتایا جا سکتا - آپ اتنا جان لیں کہ ادب کوئی علم نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شئے ہے جس سے ہمیں بصیرت ملتی ہے- وہ بہت سے شعبے جن سے ہمیں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، انہی میں سے ایک ادب بھی ہے- ادب تخلیقی سطح پر اپنا کام کرتا ہے اور زندگی کی تفسیر بھی پیش کرتا اور بعض اوقات حل بھی- چوں کہ ادب کا تعلق تخلیق سے ہے اس لیے دیگر بہت سے علوم سے اسے امتیاز حاصل ہے، کیوں کہ ان علوم کا تعلق تخلیق سے نہیں ہے اس کی اپنی روایت ہے جو صدیوں پرانی ہے- اس کے ساتھ بہت سے مراحل آئے اور بہت سی تحریکیں بھی اس سے وابستہ ہوئیں، جن کا تعلق سماج سے بھی تھا، مذہب سے بھی اور جز وقتی تاریخ سے بھی- یہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ ہوسکتا ہے کہ مذہب کو ادب کی ضرورت نہ پڑے تاریخ اور اقتصادیات کو ادب کی ضرورت نہ ہو اور ہوسکتا ہے کہ سماجیات اور تہذیب کو ادب کی ضرورت نہ ہو، لیکن ادب کو ان تمام چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے-

جام نور: ہم نے یہ سوال اس لیے کیا کہ ہم جان سکیں کہ ادب کے دائرے سے مذہبی تحریروں کو یکسر خارج کیوں سمجھا جاتا ہے، کیا مذہب میں ادب کا کوئی تصور نہیں ہے؟ یا ادب میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے؟

پروفیسر عتیق اللہ: آپ کا یہ سوال ذرا وضاحت طلب ہے، ایک لحاظ سے تو مذہبی تحریریں بھی ادب میں شامل ہیں، لیکن وہ ادب جس کا تعلق تخلیقیت سے ہے، اس میں مذہبی تحریریں نہیں آتیں- ہم تاریخ سے تو یہ توقع کرتے نہیں ہیں کہ وہ ادب ہو، اسی طرح ہم جغرافیہ اور ریاضی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ ادب ہو تو پھر ہم مذہبی تحریروں کے تعلق سے یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ وہ ادب میں شامل ہوں- ادب کی اپنی روایت اور وضع ہے، اس لیے ہم ہر تحریر کو ادب میں شامل نہیں کر سکتے - اگر ہم ان تمام چیزوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کریں تو ہم بہت سے خطرات سے بچ سکتے ہیں- ادب سے یہ کبھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسے ایسا ہونا چاہیے- ادب کی تاریخ میں جب بھی کسی نے یہ توقع کی کہ ادب کو ایسا یا ویسا ہونا چاہیے تو پھر وہ ادب نہیں رہا، بلکہ وہ نصائح کی کوئی کتاب ہوگئی یا پھر مسائلی نوعیت کی کوئی چیز ہوگئی- غالباً انہی سب وجوہات کے پیش نظر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ مذہبی تحریریں ادب میں شامل نہیں ہیں اور میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ

درست بھی ہے- مذہبی تحریروں کی ادب میں عدم شمولیت سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کی حیثیت کسی بھی درجے میں کم ہے، چوں کہ ادب کا تعلق تخلیقی نوعیت کی تحریروں سے ہوتا ہے- اس لیے مذہب کی طرح دوسرے علوم کے مشمولات کو بھی اس سے الگ رکھا جاتا ہے-

جام نور :موجودہ عہد میں شعبۂ اردو میں تحقیق کا معیار گرتا جارہا ہے،اس کے اسباب کیا ہیں؟ اوراس کے ذمہ دارکون ہیں؟

پروفیسر عتیق اللہ :آپ صرف تحقیق ہی کی بات کیوں کررہے ہیں، مجموعی حیثیت سے ہر شئے پر زوال آیا ہے، درس وتدریس، علم وفکراورزبان و بیان- اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نااہل حضرات کو استاذ کی حیثیت سے تقرر کرلیا جاتا ہے جن کا تعلق نہ تو علم سے ہوتا ہے اور نہ تحریر وتدریس سے، ایسی صورت میں جو طلبہ ان کے زیرنگرانی تحقیق کرتے ہیں یا تعلیم حاصل کرتے ہیں ان سے اچھے معیار کی توقع نہیں کی جاسکتی- موجودہ عہد میں تحقیقی ورک جسے پی ایچ ڈی یا ایم فل وغیرہ کہا جاتا ہے وہ صرف معاش کے حصول کے لیے ہورہا ہے، گویا تحقیق برائے علم نہیں بلکہ معاش ہے، اس لیے ہمارے طلبہ اور اساتذہ کا مطمح نظر بھی ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے-

جام نور :ادب میں گروپ بندی کے اسباب کیا ہیں اوراس کے نقصانات کیا ہیں؟

پروفیسر عتیق اللہ :ادب میں گروپ بندی ہر دور میں رہی ہے، اساتذہ میں گروپ بندی تھی، ان کے اپنے اپنے خیمے بٹے ہوئے تھے، ان کے شاگردوں کا وسیع دائرہ ہوا کرتا تھا، ان کی آپس میں کافی رنجشیں رہا کرتی تھیں اور کافی علمی معرکے ہوا کرتے تھے، تو ادب میں گروپ بندی اور گروہ بندی ہر دور میں رہی ہے، اس کے کچھ نقصانات تو ہوئے لیکن وہ عارضی تھے- ان نقصانات کے اثرات دیرپا نہیں رہے- مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ غالب کے دور میں غالب تنہا تھے اور ان کے مخالفین کی تعداد زیادہ تھی جو ذوق کے ساتھ تھے یا اقبال کا لہجہ منفرد تا اس لیے لوگ ان کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن آج ان تمام باتوں کا کوئی اثر نہیں، غالب غالب بن کر سامنے آئے اور اقبال کا نام فکر وفلسفے کا استعارہ بن گیا- ہاں! ادب میں آج جو گروپ بندی ہے وہ ماضی سے مختلف ہے، اس گروپ بندی یا گروہ بندی کا تعلق ادب سے نہیں ہے بلکہ سیاست سے ہے- اس گروپ بندی میں شامل افراد اہل سیاست سے زیادہ قریب ہیں، میڈیا سے ان کے اچھے مراسم ہیں اور انتظامیہ کے ان سے تعلقات وسیع تر ہیں جسے یہ اپنے گروپ کے افراد کو مناصب یا ایوارڈ یا نوکری دلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں-

اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات انتہائی اہم مناصب پر بعض ایسے جاہل آجاتے ہیں جن سے اہم اداروں کا نقصان ہوتا ہے، لوگ ان اداروں کا مذاق اڑاتے ہیں- غیر مستحقین کو ایوارڈز دے دیئے جاتے ہیں اور مستحقین کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے- ان تمام بگاڑ کی وجہ صرف ہم ہیں، اس سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں- اس لیے آج کی ادبی گروپ بندی سے نقصانات زیادہ ہیں کیوں کہ اس گروپ بندی کا تعلق ادب سے نہیں ہے-

جام نور :اردوزبان کی ترویج واشاعت کے حوالے سے علما اور مدارس کی خدمات کو نظرانداز کیا جاتا ہے، جب کہ اس میں سب سے نمایاں کردار انہی کا ہے، ایسا کیوں؟

پروفیسر عتیق اللہ :اردوزبان مدارس اور علما کی اظہار کی زبان رہی ہے اور اب بھی ہے، لیکن بنیادی طور پر ان کا مطلوب و مقصود اردوزبان کی ترویج واشاعت نہیں رہا ہے- انہوں نے زبان کی تاریخ پر کچھ نہیں کیا، اسالیب پر بحث نہیں کی اور ادب پر کام نہیں کیا، کیوں کہ یہ ان کا دائرہ کار نہیں تھا- اس لیے اس حوالے سے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا- پھر بھی سچائی یہ ہے کہ انہوں نے اردو کو اظہار کا ذریعہ بنا کر بالواسطہ اس کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے- اس سچائی کا کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہی ہے- یہی وجہ ہے کہ مدارس کے طلبہ کی اردو نسبتاً اچھی ہوتی ہے- حالاں کہ مدارس میں بھی اس حوالے سے زوال آیا ہے، تاہم پھر بھی وہ بہتر ہیں-

جام نور :ہندوستان میں اصناف سخن میں اب تک حمد ونعت کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جاسکا جو غزل، نظم اور دیگر اصناف کا ہے؟

پروفیسر عتیق اللہ :جہاں تک حمد ونعت پر کام کرنے یا لکھنے کا تعلق ہے تو اب حالات بہت مختلف ہیں- ان پر مستقل کتابیں لکھی جارہی ہیں اور رسائل وجرائد نکل رہے ہیں- اب رہی بات حمد و نعت کو صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا مسئلہ تو یہ جان لیں کہ کوئی بھی صنف یا ہیئت ابتدا میں اپنا ایک تجربہ رکھتی ہے، لیکن تجربے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس نے اپنی ایک مکمل شکل بنالی ہے- یہ مکمل شکل جب بنتی ہے جب کسی خاص رنگ وآہنگ کا شاعر آتا ہے اوراپنے منفرد

اسلوب اور طرز سے اسے صنف کی حیثیت دے دیتا ہے- مثلاً اقبال آئے اور اپنے لب و لہجے کی انفرادیت کی وجہ سے نظم کا چلن بنا دیا اور نظم کو ایک مکمل صنف کی حیثیت دے دی- اسی طرح آزاد نظمیں بھی لکھی جاتی رہیں، مگر اس کو وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا، پھر ن م راشد آئے اور انہوں نے اتنے پاورفل طریقے سے آزاد نظمیں کہیں کہ آزاد نظم کو بھی ایک ہیئت تسلیم کر لیا گیا- اگر حمد و نعت کا بھی کوئی ایسا فنکار شاعر آیا ہوتا تو ضرور حمد و نعت کو صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جاتا-

جام نور :ڈاکٹر صاحب! نعت کہنے کی روایت کوئی نہیں ہے، یہ روایت عہد رسالت سے اب تک تواتر کے ساتھ چلی آ رہی ہے- ہندوستان میں ایسے بڑے بڑے شعرا گزرے ہیں جنہوں نے بڑے پایہ کی نعتیں کہی ہیں اور مسلسل کہی ہیں جیسے مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی، مولانا حسن رضا بریلوی اور مولانا کافی مرادآبادی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے مگر پھر بھی نعت کو نظر انداز کیا گیا؟

پروفیسر عتیق اللہ :دیکھئے! آپ اصرار کر کے کسی کو اس کا مقام نہیں دلا سکتے- اگر کسی تخلیق میں قوت کشش ہے تو اسے توجہ دلانے کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ وہ خود بخود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے- نعت کے حوالے سے موجودہ عہد میں کوئی تو کمی رہ گئی ہے کہ لوگ اسے اس حیثیت سے تسلیم کرنے کی طرف مائل نہیں ہو پا رہے ہیں- شاید ہندوستان میں نعتیہ شاعری روایتی ڈھنگ سے کی جا رہی ہے یا اس میں تجرباتی مضامین شامل نہیں کیے جا رہے یا اس کے اسلوب میں وہ لپک نہیں جو ادبا کو اپنی طرف مائل کرے- یہ کمیاں دور ہوں گی تو اسے خود بخود وہ مقام حاصل ہوگا، ہمارے یا آپ کے چاہنے سے نعت و حمد کو ادبی مقام نہیں مل سکتا-

جام نور :اردو شعبہ جات کے طلبہ عربی اور فارسی کے مبادیات سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں، کیا یہ اردو کے لیے فال نیک ہے؟ کیا اردو کے لیے عربی اور فارسی کے مبادیات سے واقفیت ضروری نہیں ہے؟

پروفیسر عتیق اللہ :دیکھئے! اردو زبان کی فہم کے لیے عربی سے واقفیت ضروری نہیں، گو کہ اردو کے ڈانڈے عربی سے ملتے ہیں، لیکن وہ ہمیں فارسی کے توسط سے ملتے ہیں اس لیے اردو سے اچھی طرح واقفیت کے لیے فارسی کے مبادیات سے واقف ہونا ضروری ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ سماجی حالات بہت بدل چکے ہیں، پہلے فارسی پڑھنا لازمی حیثیت رکھتا تھا مگر اب فارسی نہ تو گھروں میں پڑھائی جاتی ہے، نہ اسکولوں اور نہ ہی کماحقہ مدرسوں میں، اس لیے فارسی جاننے والے دن بدن کم ہوتے جا رہے ہیں- چوں کہ اب صورت حال بدل چکی ہے اور درمیان میں بہت سے علوم آ گئے ہیں اس لیے فارسی کے مبادیات سے ناواقفیت کے باوجود بہت زیادہ فرق نہیں پڑ رہا ہے اور نہ کسی طرح کا نقصان ہو رہا ہے- جہاں تک مختلف زبانوں سے آشنا ہونے کا تعلق ہے تو جتنی زیادہ زبانیں آپ جانیں گے اتنی ہی زیادہ آپ کو ادب کی فہم ہوگی اور مختلف علوم اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی- اس لیے مغربی ممالک کے اسکولوں میں کم از کم تین زبانیں ضرور سکھائی جاتی ہیں- ہمارے ہندوستانی تناظر میں اب انگریزی زبان سیکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے- یہ موجودہ عہد کی زبان ہو گئی ہے، اسی لیے خواہ آپ تجارت کرنا چاہیں، نوکری کرنا چاہیں یا دعوت و تبلیغ کا کام کرنا چاہیں انگریزی سے واقفیت کے بغیر موجودہ عہد میں وسیع پیمانے پر کام نہیں کیا جا سکتا- ہمارا خیال ہے کہ ہر طالب علم کو پہلی جماعت سے ہی انگریزی پڑھائی جانی چاہیے-

جام نور :اردو اکیڈمیوں سے اردو میں شائع ہونے والی سیرت اور تاریخ اسلام وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت کیوں نہیں ہوتی ہے؟ جب کہ جب ادارہ اردو کے نام سے ہے تو اردو میں لکھی جانے والی ہر اہم کتاب کی اشاعت اس سے ہونی چاہیے؟

پروفیسر عتیق اللہ :اردو کے نام پر جو ادارے قائم ہیں وہ حکومت کے زیر انتظام ہیں اور ان کی اپنی پالیسی ہے جس کے تحت یہ ادارے چلتے ہیں، اس میں ہم اور آپ دخیل نہیں ہو سکتے- مذہبی کتابوں کی اشاعت اگر آپ چاہتے ہیں تو اپنے نجی ادارے قائم کیجیے- پھر یہ بھی درست نہیں کہ اردو کے نام پر قائم ہونے والے ہر ادارے سے اردو ادب کی ہی کتابیں شائع ہوتی ہیں- مثلاً ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' ایک بڑا حکومتی ادارہ ہے جہاں سے زیادہ تر سماجی علوم اور طب کی کتابیں شائع ہوتی ہیں، کیوں کہ یہ ان کی پالیسی کا حصہ ہے- پھر آپ کی شکایت اس لیے بھی درست نہیں کہ جو حکومتی ادارے ہندی کے فروغ کے نام پر چل رہے ہیں وہاں سے بھی ہندوؤں کی مذہبی کتابیں شائع نہیں کی جاتیں-

جام نور :مدارس کے طلبہ کا میڈیم اردو ہے، وہ اردو ہی لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں، مگر اس کے باوجود عام طور پر ان کی نثر میں وہ سادگی نہیں پائی جاتی جو اردو کا معیاری اسلوب ہے، اس حوالے آپ انھیں کیا مشورہ دینا چاہیں گے-

پروفیسر عتیق اللہ :مدارس میں عربی زبان میں کتابیں شامل درس ہوتی ہیں اور عربی کی مشق وممارست زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے ان کے ذہنوں میں عربی کی ادق تراکیب اور لفظوں کے گچھے پیوست ہوجاتے ہیں، نتیجتاً جب وہ اردو بھی لکھتے ہیں تو وہی تراکیب اور اسلوب حاوی رہتے ہیں- اس انداز تحریر میں معانی گم ہوکر رہ جاتے ہیں اور لفظوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایسی تحریریں اثرات قائم نہیں کرپاتیں بلکہ بعض دفعہ مضحکہ خیز ہوجاتی ہیں- اس لیے انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ جس مقصد کے تحت وہ یہ تحریریں لکھ رہی ہیں جب وہ مقصد ہی پورا نہیں ہورہا ہے تو پھر ایسی تحریروں، مضامین اور کتابوں کا کیا فائدہ؟ اس کی روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ ان بچوں کی تربیت کریں اور انھیں ایسا لٹریچر مہیا کرائیں جو ان کی قلمی تربیت کرسکے- اس کے ساتھ یہ سچائی بھی ہے کہ پہلے کی بہ نسبت اس صورت حال میں کمی آئی ہے اور مدارس کے فارغین اچھی نثر لکھ رہے ہیں-

جام نور :اخیر میں ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

پروفیسر عتیق اللہ :سب سے پہلے تو آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ تشریف لائے- اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ جام نور بہت بڑی دینی وعلمی خدمت انجام دے رہا ہے اور مسلمانوں کے مسائل کو عصری اسلوب میں پیش کررہا ہے- جام نور کی یہ انفرادیت مجھے پسند آئی کہ وہ نہ صرف دینی ومسلکی امور کو سامنے لارہا ہے بلکہ مسلمانوں کے جدید مسائل پر بھی توجہ دے رہا ہے-

ہندوستان ایک تکثیری ملک ہے، یہاں پر مختلف ادیان اور تہذیبوں سے وابستہ افراد بستے ہیں، یہاں کے مسلمانوں نے جس طرح ان تہذیبوں کو متاثر کیا، خود بھی کہیں نہ کہیں ان کے اثرات قبول کیے- یہاں کے مسلمانوں کے مسائل سعودی عربیہ اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے مسائل سے مختلف ہیں، جس طرح افریقا اور بنگلہ دیش کے مسلمان اپنی مقامی تہذیبوں سے متاثر ہیں، ہندوستانی مسلمانوں میں بھی مقامی اثرات پائے جاتے ہیں، اس لیے جس طرح سلفی حضرات مکمل Purification کی بات کرتے ہیں یہ زیادتی ہے- یہ تشدد پسندانہ رویہ کم از کم یہاں کے لیے صحیح نہیں ہے، اسی طرح ہندوستانی مسلمان مختلف مسالک اور مکاتب فکر میں بٹے ہوئے ہیں- اب یہاں مسلک کے نام پر مسلمانوں کی اجتماعیت کو توڑنا اور خود کو منتشر کرنا، اچھا رویہ نہیں ہے، یہ ٹھیک ہے کہ مسالک کی اپنی ترجیحات ہیں، ان کے مطابق ہر مسلک والے کو عمل کرنے کا حق ہے، لیکن اس حق کا استعمال اگر اس طور پر ہو کہ دوسروں کے ساتھ جنگ اور نفرت کا ماحول بنے، یہ اچھی بات نہیں ہے- ہم تو اہل وحدت ہیں، ہندوستانی اقوام جو اہل کثرت ہیں وہ مختلف خداؤں کو پوجنے کے بعد بھی متحد ہیں اور ہم ایک خدا کی عبادت کرنے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں، ہمیں اپنے انداز فکر وعمل کا احتساب کرنا چاہیے، اپنے اندر توسع پیدا کرنا چاہیے- جام نور کو بھی اپنی ترجیحات میں ان باتوں کا خیال کرنا چاہیے-□□□

ڈاکٹر چاند نظامی☆

علامہ ارشد القادری کی مقدمہ نگاری

برادرم مولانا خوشتر نورانی صاحب! سلام مسنون......خدا کرے بخیر ہوں-ایک تخلیق حاضر کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اسے شامل اشاعت فرما کر ممنون فرمائیں گے-جام نور اب ایک تحریک بن چکا ہے اور ملت کے اندر مسلک کے نام پر برسوں سے جمی ہوئی برف اب پگھلنے لگی ہے-لوگوں کے غور وفکر کا سانچہ بدلنے لگا ہے، تنگ نظری کے دائرے گھٹنے لگے ہیں اور صحیح وغلط کو پرکھنے کا انداز بدل رہا ہے-نیز مسلک کے تحفظ کی بھی فکر دامن گیر ہوئی ہے-یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ آپ نے ان اکابرین کی خدمات کے صفحات پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرنے کا ایک قابل ستائش سلسلہ شروع کیا ہے جن کے معتقدین و پیرو فقط ایک مرکز کے گرد چکر کاٹنے کو راضی نہ تھے اور نتیجتاً اپنی ڈفلی اپنا راگ کا معاملہ ملت کے اتحاد کو ڈس رہا تھا-چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے-حالانکہ اس روش پر قائم رہنے کے لیے آپ کو بعض آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑ سکتا ہے-

والسلام محمد چاند نظامی

بیسویں صدی میں مغرب کے زیر اثر کتابوں میں پیش لفظ، دیباچہ اور مقدمہ شامل کرنے کا رواج عام ہوا، جس کا مقصد تصنیف و تالیف کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کرنا ہے جس سے اس کے موضوع اور پیش کرنے کے انداز کا علم ہو سکے-اردو میں اس کی ابتدائی صورت فضلی کی 'کربل کتھا' میں نظر آتی ہے اور مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے نئے شعری تصور کی بنیاد اسی کو بنایا-

اکثر ناقدین پیش لفظ، دیباچہ اور مقدمہ کو ایک ہی طرح کی تحریر مانتے ہیں، لیکن بعض کے نزدیک ان تینوں کی حیثیت جداگانہ ہے- حالانکہ وہ بھی ان تینوں میں کوئی واضح فرق نہیں کر پاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک پیش لفظ، دیباچہ اور مقدمہ لکھنے کا کوئی اصول وضع نہیں کیا جا سکا ہے-عموماً ان تینوں طرح کی تحریروں میں متعلقہ کتاب کے موضوع کی افادیت بیان کی جاتی ہے، بہ لحاظ موضوع یہ کتاب جس کمی کو پورا کرتی ہے اس کی نشاندہی کی جاتی ہے- اس سے استفادہ کرنے والے طبقات وشعبہ جات کی وضاحت کی جاتی ہے- اس کی عصری اہمیت اجاگر کی جاتی ہے اور جن امور میں یہ فائدہ پہنچائے گی اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے- مقدمہ کی تعریف کرتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''مقدمہ وہ تحریر ہے جسے کوئی مصنف کتاب کے شروع میں شامل کرتا ہے-اس میں کبھی تو اس کتاب کے وہ متعلقات زیر بحث آتے ہیں جن کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ پوری طرح معلوم ہو جائیں، کبھی موضوع کتاب کے متعلق بعض اصولوں اور تحقیقات کا بیان ہوتا ہے کہ پڑھنے والا پوری طرح ان سے واقف ہو جائے-''

(اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت از ارم سلیم، ص ۳۸)

اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی بذریعے مثال اسے یوں واضح کرتے ہیں:

''روزمرہ کے مشاہدہ سے مدد لیجیے-آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز سے گزریں گے تو دیکھیں گے کہ دکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دلفریب طریقے سے آراستہ اور سب سے اول دیدہ نواز ہوگا-یہ اپنی دلفریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کرے گا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جویا ہوگی تو بتائے گا کہ آپ کو جو جنس دکان میں ملے گی وہ کیا ہے-بعینہ یہی حال ایک کتاب کے مقدمے کا ہے کہ وہ آپ کو دلکش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے-''

(مقدمات عبدالحق، حصہ اول، مرتب مولوی مرزا محمد بیگ، ص:۳)

مقدمہ چونکہ کسی خاص انداز نقد سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے یہ تحقیقی بھی ہو سکتا ہے، تنقیدی بھی اور غیر ضروری تعریف وتوصیف کی بنا پر تقریظ نما بھی-بعض اوقات اس میں سوانح عمری بھی شامل ہو جاتی ہے- جہاں تک مقدمہ میں تنقید کا تعلق ہے تو یہ تنقید بالعموم متن کی خوبیاں اجاگر کرنے تک ہی محدود ہوتی ہے-بقول ڈاکٹر گیان چند:

''چونکہ یہ فرمائشی تنقید ہے، اس لیے اس میں غالب کی طرفداری سے کام لیا جاتا ہے-''

☆S.K.A.B High School,Hazari Bagh(Jharkhand)

(ماہنامہ شب خون، الہ آباد، دسمبر ۸۶ء وجنوری ۸۷ء)

یہ فریضہ اکثر کوئی دوسرا عالم ہی انجام دیتا ہے اور وہ مصنف کی علمی صلاحیت، ذہنی رسائی، انداز بیان اور علمی وادبی کارناموں یا نظریات پر روشنی ڈالتا ہے- کیونکہ یہ کام مصنف بوجہ لحاظ خود نہیں کرسکتا اس لیے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ یہ فریضہ کوئی ایسا عالم ہی انجام دے جس کی علمی اہمیت مسلم ہو- اگر چہ مقدمے کی طوالت پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن ایک مقدمہ بالعموم ۲۰،۲۵ صفحات تک ہوسکتا ہے- بقول احمد ندیم قاسمی:

''اس ابتدائی تحریر کی ضخامت تک کا کوئی تعین نہیں ہے کہ میں نے ایک صفحے کے دیباچے بھی دیکھے ہیں اور کوئی درجن صفحات پر تعارف کو ہی محیط پایا ہے-''

(بحوالہ اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، ص:۵۴)

بہر حال علامہ ارشد القادری بھی دیگر ادیبوں اور قلم کاروں کی طرح اس فریضے سے عہدہ برآ ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی تصنیفات کے علاوہ دوسرے معتبر قلم کاروں کی تصنیفات پر بھی مقدمے اور پیش لفظ لکھے ہیں- ان میں سے بعض کتاب اور مصنف کا تعارف ہونے کے ساتھ ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ تحریر معلوم ہوتی ہے- مثلاً ''انوار الحدیث'' میں شامل مقدمے میں وہ مفتی جلال الدین احمد امجدی صاحب کی اس کاوش کی اہمیت وافادیت اجاگر کرنے کے بعد حدیث کی تعریف، اس کے اقسام، اس کی دینی حیثیت، اس کے حجت ہونے پر استدلال، اس کا اصول نقد اور اس کی تاریخ تدوین وغیرہ پر بھی مدلل بحث پیش کرتے ہیں- اسی طرح ''عجائب الفقہ'' کے مقدمے میں وہ کتاب کے موضوع ومواد سے روشناس کرانے کے بعد فقہ کی تعریف، اس کی بنیاد، ضرورت، تاریخ، ادوار، ماخذ اور اصول وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں- ''محمد عربی میدان جنگ میں'' میں تو وہ کتاب کے مشتملات کا کہیں ذکر تک نہیں کرتے اور آغاز میں ہی جہاد کیوں اور کس لیے، جہاد قرآن وحدیث کی روشنی میں اور جہاد واقعات کی روشنی میں کے عناوین کے تحت صرف اپنی بات قلم بند کرتے ہیں- حالانکہ اس بحث سے بھی کتاب کے مشتملات سے قاری کا ذہن استوار ہوجاتا ہے- یہی سبب ہے کہ متذکرہ بالا تینوں مقدمات کو ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب نے کتابی شکل میں شائع کرکے علامہ کی تصنیفات میں ایک اور کتاب کا اضافہ کردیا-

بہر کیف! وہ مقدمے اور پیش لفظ کی ابتدا اتنے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی خود بخود کتاب میں پیدا ہوجاتی ہے- کتاب اور مصنف کو متعارف کرانے کا انداز بھی اچھوتا ہے- بعض مقدمات میں مصنف کا مختصر سوانح بھی پیش کرتے ہیں- مثلاً ''فضائل درود'' کے مصنف علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی کی سوانح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں مصر کے قبیلۂ نبہان میں پیدا ہوئے- آپ کا شمار شیخ المحققین حضرت ابراہیم سقا شافعی کے نامور تلامذہ میں ہوتا تھا........لبنان کے دار الخلافہ بیروت میں وہ عرصۂ دراز تک عہدۂ قضا پر مامور رہے اور اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے سرکاری لائبریری کے نگران اعلیٰ کی ذمہ داری بھی قبول فرمائی..........۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۱ء میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے آبائی وطن اجزام میں آسودۂ خاک ہوئے-''

(فضائل درود مترجم مولانا حکیم محمد اصغر فاروقی، ص:۷،۸)

اور ''انوار احمدی'' کے مصنف شیخ الاسلام مولانا شاہ انوار اللہ فاروقی صاحب کے متعلق وہ یہ معلومات قلم بند کرتے ہیں:

''حضرت فاضل مصنف کی ولادت باسعادت ۴؍ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ میں ضلع ناندیر میں ظہور پذیر ہوئی ....حضرت فاضل مصنف کا سلسلۂ نسب والد ماجد کی طرف سے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور والدۂ محترمہ کی طرف سے حضرت سید امیر کبیر رفاعی سے جاملتا ہے- ان کے والد بزرگوار ابومحمد شجاع الدین بڑے متبع سنت اور عالم باعمل بزرگ تھے-

حضرت شیخ الاسلام کی ابتدائی تعلیم والد محترم سے ہوئی- سات سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید کے لیے آپ کو حافظ امجد علی نابینا کے سپرد کیا گیا، چار سال میں کلام مجید حفظ کرلیا- فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے آپ مولوی فیاض الدین اورنگ آبادی کے حوالے کیے گئے- تفسیر، حدیث، فقہ، ادب اور معقولات کی تکمیل فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی- ۱۲۸۴ھ میں اپنے وقت کے مشہور عالم دین مولانا حاجی امیر الدین کی صاحبزادی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے-''

(پیش لفظ، انوار احمدی، ص ۳۸،۳۹)

علامہ کا مصنفین کو متعارف کرانے کا انداز بھی منفرد ہے- وہ کم سے

کم الفاظ میں مصنف کی شخصیت کے ہر پہلو کو اجاگر کر کے رکھ دیتے ہیں- مفتی جلال الدین احمد امجدی صاحب کو متعارف کرانے کا انداز دیکھیے:

''عزیز گرامی حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد صاحب امجدی دامت برکاتہم کو خداوند کریم نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے- وہ بلند پایہ اور راسخ العلم مدرس بھی ہیں، حاضر دماغ اور بالغ نظر مفتی بھی، خوش بیان اور نکتہ رس خطیب بھی ہیں اور فکر انگیز وحقائق نگار مصنف بھی اور ان ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ متواضع، شریف النفس اور عالم باعمل بھی- ان کے بے شمار تلامذہ ان کے علم وفضل، ان کے دینی تصلب اور ان کی تقویٰ شعار زندگی کا آئینہ ہیں-'' (مقدمہ عجائب الفقہ، ص:۱۵)

اور مولانا یٰسین اختر مصباحی کو یوں متعارف کراتے ہیں:

''حضرت مولانا موصوف اردو اور جدید عربی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں- اردو تو ان کی مادری زبان ہے، لیکن عہد طالب علمی سے ہی عربی ادب کے ساتھ جوان کا شغف رہا ہے اس نے رفتہ رفتہ انھیں عربی زبان کا ادیب بنا دیا-............ان کے مبلغ علم کے بارے میں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ ہندوستان کی بین الاقوامی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں شعبۂ عربی کے استاذ کی حیثیت سے انہوں نے آٹھ دس سال تک تدریس کے فرائض انجام دیے ہیں............ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اشرفیہ کے زمانۂ تدریس میں طلبہ کے اندر تحریری ذوق کی بیداری اور ان کی فکری رہنمائی کا جو عظیم الشان کارنامہ انہوں نے انجام دیا ہے، اس کے اثرات آج پورے ملک میں محسوس کیے جا رہے ہیں............عربی علوم وفنون میں گہرے رسوخ کے ساتھ ساتھ وہ بالغ نظر مفکر اور بلند پایہ محقق کی حیثیت سے بھی اپنے اقران میں امتیازی خصوصی کے حامل ہیں......اخلاقی محاسن کے اعتبار سے بھی وہ ایک پرکشش شخصیت کے مالک ہیں- علم وفضل کے ساتھ ساتھ دیانت وتقویٰ کی نعمت سے بھی وہ آراستہ ہیں......اوقات کا تحفظ اور زندگی میں نظم و ضبط ان کی قابل تقلید خصوصیات ہیں............''کام زیادہ اور باتیں کم'' کے اصول پر وہ سختی سے عمل پیرا ہیں- موصوف کی گفتگو میں جذبات کا عنصر کم اور معقولیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے-''

(امام احمد رضا اور رد بدعات ومنکرات)

تصنیفات کی اہمیت وافادیت کی وضاحت اور اس کی قدر وقیمت کا تعین کرتے ہوئے بھی وہ اختصار سے کام لیتے ہیں اور صرف چند جملوں میں کتاب کے مشتملات سے قاری کو روشناس کرا دیتے ہیں- مثلاً مولانا بدر الدین احمد قادری صاحب کی کتاب ''سوانح اعلیٰ حضرت'' کے موضوع و مواد نیز اس کی قدر وقیمت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ پر ''سوانح اعلیٰ حضرت'' کے نام سے حضرت ممدوح کی یہ پہلی کتاب ہے جو مقبول عام کی عزت سے سرفراز ہوئی اور ملک ہی میں نہیں بیرون ملک بھی دنیا کے کروڑوں افراد کو اعلیٰ حضرت کے دینی اور علمی کارناموں اور ان کے عظیم مقام مجد وشرف سے نہایت مؤثر طریقے پر روشناس کرایا.........اس کتاب مستطاب کی ثقاہت اور مقام اعتبار کا اندازہ لگانے کے لیے یہ واقعہ بہت کافی ہے کہ اعلیٰ حضرت پر لکھنے والے سارے اہل قلم نے اسے پورے اعتماد کے ساتھ ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا اور آئندہ بھی جب کوئی اعلیٰ حضرت پر قلم اٹھائے گا تو اس کتاب سے استفادہ کیے بغیر وہ اپنے موضوع کا حق کامل طور پر نہیں ادا کر سکے گا-'' (پیش لفظ سوانح اعلیٰ حضرت، ص:۳،۴)

یونہی ''حقیقت گلزار صابری'' کے مشتملات کو وہ یوں سمیٹ کر کتاب سے قارئین کی دلچسپی پیدا کرتے ہیں:

''سلسلۂ صابریہ کی یہ سب سے عظیم کتاب ہے جو حضور صابر پاک کے احوال وکرامات اور مقامات وکمالات پر معلومات کا بیش بہا ذخیرہ فراہم کرتی ہے- علاوہ ازیں یہ کتاب سلسلہ عالیہ صابریہ کے مختلف خانوادوں کے مشائخ وخلفا کے احوال وکرامات اور کمالات وتعلیمات سے بھی ہمیں پوری طرح روشناس کراتی ہے-

کتاب کے مصنف حضرت مخدوم شاہ محمد حسن صابری چونکہ خود ہی صابری سلسلے کے ایک صاحب سنیت اور صاحب دل بزرگ تھے اس لیے اس کتاب میں انہوں نے سلوک وتصوف کے رموز واشارات اور تزکیۂ قلب کے لیے اذکار واشغال، اوراد ومراقبات اور ریاضات و مجاہدات کی تشریح وتفصیل کا حق جس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے یہ انہی کا حصہ ہے-'' (کلمۂ تقدیم حقیقت گلزار صابری، ص:۳)

دوسروں کی تصنیفات کے علاوہ علامہ نے اپنی بعض تصنیفات پر بھی مقدمات وپیش لفظ تحریر فرمائے ہیں- ان سے بھی مقدمہ نگاری کے فن سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے- مثال کے طور پر ''نقش کربلا'' کے تعارف کا انداز دیکھیے:

''زیر نظر کتاب ''نقش کربلا'' شہدائے کربلا اور اہل بیت اطہار کے ان رقت انگیز واقعات پر مشتمل ہے جن کو پڑھ کر ہر رقیق القلب اور مومن دل جذبات کے تلاطم میں بے خود ہوئے بغیر نہیں رہتا اور جنہیں پڑھنے کے بعد وفور غم میں بھیگی ہوئی پلکوں کی نمی مدت تک قائم رہتی ہے۔'' (نقش کربلا از علامہ ارشد القادری، ص:۴)

اور ''زلزلہ'' کو متعارف کرانے نیز اس کے مندرجات سے قاری کی دلچسپی پیدا کرنے کا یہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیے:

''اس کتاب کے مندرجات کے ذریعے میں مسلمانوں کی عدالت سے صرف اس بات کا فیصلہ چاہتا ہوں کہ جن باتوں کو علمائے دیوبند انبیا و اولیا کے حق میں شرک قرار دیتے ہیں اگر قرآن وحدیث کی رو سے واقعتاً وہ شرک ہیں تو پھر انہوں نے اپنے گھر کے بزرگوں کے حق میں اسے کیوں جائز ٹھہرالیا ہے؟ اور اگر قرآن وحدیث کی رو سے وہ شرک نہیں ہیں تو انبیا و اولیا کے حق میں انہوں نے کیوں اسے شرک قرار دیا ہے؟'' (زلزلہ-ص:۵۱،۵۲)

مختصر یہ کہ علامہ کے مقدمات وپیش لفظ میں ہمیں تحقیق، تنقید اور توصیف تینوں اقسام نظر آتے ہیں- انہوں نے یک ورقی دیباچے بھی لکھے ہیں اور ۶۴ ورقی مقدمہ بھی- مصنفین کی تعریف وتوصیف میں غلو اور اظہار عقیدت سے گریز کرتے ہوئے انہی اوصاف کا تذکرہ کیا ہے جن سے اہل علم کا طبقہ کماحقہ واقف ہے نیز کتاب کے مشتملات سے بحث کرتے ہوئے معتدل مزاجی اور وسعت مطالعہ کا واضح ثبوت فراہم کیا ہے- ان کے مقدمات کی زبان بھی دلکش، رواں اور برجستہ ہے- ان کے اسلوب کی انفرادیت یہاں بھی قائم رہتی ہے- ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس:

''اس دور میں دین حق کے خدام کی کمی نہیں ہے لیکن دل کی ایسی والہانہ وارفتگی جو اپنا سب کچھ لٹا کر بھی دین کے لیے جذبے کی تشنگی کو آسودہ نہ ہونے دے، خال خال نظر آتی ہے- اس طرح کا دل دیوانہ اگر کہیں مل جائے تو وہ دل نہیں نگار خانۂ رحمت وقدرت کا آبگینہ ہے جسے ٹوٹنے سے بچانا دل ہی کی نہیں دین کی بھی خدمت سمجھتا ہوں-''

(سوانح اعلیٰ حضرت، ص:۴،۵)

الغرض علامہ کی مقدمہ نگاری جملہ محاسن سے مملو ہے جن میں بڑی ادبیت پائی جاتی ہے اور ایک مقدمہ نگار کی حیثیت سے بھی علامہ کی حیثیت مسلّم ہے-□□□

بقیہ: محمد الغزالی کا تصوف: آخری باب شارات الطریق کے ذیل میں توبہ، رغبت الی اللہ، کن باتوں سے توبہ کریں؟ توبہ کے درجات، خواص کی توبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار، ورع، عفت اور قناعت، صبر وشکر، خوف ورجا، توکل اور حب کے معانی ومفاہیم کی تعبیر وتشریح ذہن جدید کو سامنے رکھ کر کیا ہے- خاتمہ میں اللہ کا شکر ادا کیا ہے جس کی توفیق سے تمام تر مصروفیات کے باوجود یہ ایک مفید مطلب کام پورا ہو گیا- خاتمہ میں انہوں نے اس احساس کا بھی ذکر کیا ہے کہ بہت سے قارئین مجھ سے سوال کریں گے کہ اسلام کے داخلی پہلو کے حوالے سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں کیا ہیں؟ لیکن اس کام کے لیے جو محنت اور وقت مطلوب ہے، اس کے فقدان کے سبب الغزالی نے اپنے قارئین سے معذرت کر لی ہے- کاش ان کا قلم اس پہلو کا بھی احاطہ کر لیتا تو یہ بحث اپنی انتہا کو پہنچ جاتی- الغزالی نے اپنی تحریر کے بارے میں معاصرین سے جس ردعمل کی توقع کی ہے وہ یہ ہے: ''میں اہل سنت کے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جو یہ کہیں گے کہ مولف صوفی ہو گیا اور بعض متصوفہ یہ کہیں گے کہ یہ راہ سے بھٹک گیا اور میرے لیے بس اتنا کافی ہے کہ میں اپنے رب سے ہدایت کا طالب ہوں اور میں مختلف اوہام وخرافات سے اس دین کو پاک کرنے میں انصاف پر ہوں- وللہ الحمد اولاً وآخراً'' علم وفکر کا یہ ستارہ ۱۹۹۶ء میں غروب ہو گیا اور اب شہر رسول مدینہ منورہ میں محو خواب ہے-□□□

ڈاکٹر خواجہ اکرام کو مبارک باد

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کے ذریعے ڈاکٹر خواجہ اکرام (ایسوسی ایٹ پروفیسر جواہر لال یونیورسٹی نئی دہلی) کو ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' NCPUL کا ڈائریکٹر نامزد کیا گیا ہے- ڈاکٹر خواجہ اکرام اردو کو ایک نامور ادیب وناقد، اردو دوست اور اردو تہذیب وثقافت کے ممتاز نمائندے ہیں- موصوف کا انتخاب نہ صرف قومی کونسل کے حق میں بہتر ہے جو ایک عرصے سے ایسے مخلص کا منتظر تھا بلکہ اردو کے حق میں بھی یہ ایک نیک فال ہے- امید بلکہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں یہ اردو کا قومی ادارہ ترقی کی راہ پر بہت تیزی کے ساتھ گامزن ہو جائے گا- ادارہ جام نور اس اہم عہدے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے-

ذیشان احمد مصباحی☆

شیخ محمد الغزالی اور تصوف

'الجانب العاطفی من الاسلام' کی روشنی میں

محمد الغزالی السقا(۱۹۱۷ء-۱۹۹۶ء) مصر کے ان جدید مفکرین میں سے ایک ہیں جنھوں نے دنیا بھر میں اسلام پسند نئی نسل کو سوچنے اور برتنے کا ایک نیا رخ دیا ہے- جو اپنے سر میں سلفی دماغ اور اپنے پہلو میں صوفی دل رکھتے ہیں- محمد الغزالی کو عصر حاضر کے ایک مقبول اور متنازع اسکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے بجا طور پر **صوفی القلب لاصوفی الطریقة** کہا ہے-(www.alghazaly.org) محمد الغزالی اسکندریہ مصر کے ایک مقام البحیرہ میں پیدا ہوئے-۱۹۴۱ء میں جامعۃ الازہر سے فاروغ التحصیل ہوئے-انہوں نے جامعہ ام القریٰ مکۃ المکرّمہ، جامعہ قطر اور الامیر عبد القادر یونیورسٹی الجیریا میں تدریسی فرائض انجام دیے- انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ قاہرہ کے اکیڈمک کونسل کے چیئر مین رہے-مختلف دینی، علمی، فکری، سائنسی، اقتصادی اور سماجی موضوعات پر قریب ایک سو فکر انگیز کتابیں لکھیں- جمہوریہ مصر کا پہلا اعزازی ایوارڈ (۱۹۸۸ء) ، شاہ فیصل ایوارڈ (۱۹۸۹ء) اور حکومت پاکستان سے امتیازی ایوارڈ سے سرفراز ہوئے- محمد الغزالی کو مغرب میں بالخصوص اس حوالے سے بھی جانا جاتا ہے کہ انہوں نے مصری عدالت سے فراغ فوضیٰ جیسے سیکولر مزاج اسکالر کے قتل کا مطالبہ کیا تھا جو اعلانیہ طور پر اسلامی قوانین کے خلاف زبان درازی کرتے رہے ہیں- انہوں نے مصری حکومت سے اس بات کا بھی مطالبہ کیا تھا کہ اسلام کی ایک قانونی تعریف طے کی جائے اور جو اس دائرے میں نہ آئیں ان سے ان کے لائق سلوک کیا جائے-

کہا جاتا ہے کہ اسلام پسندی میں شہرت کے باوجود محمد الغزالی کا تعلق، مصر کے تشدد پسند جماعتوں سے نہیں تھا، جس کی مختلف صورتوں میں انہیں قیمت بھی چکانی پڑی- ان کی بعض تحریریں سعودی علما کے نقد و تبصرہ کا نشانہ بھی رہی ہیں- ان کی کتابوں میں '**الاسلام والاوضاع الاقتصادیہ**'، '**الاسلام والمناھج الاشتراکیہ**'، **جدد حیاتک**'، '**مشکلات فی طریق الحیاة الاسلامیة**'، '**سر تاخیر العرب والمسلمین**'، '**دفاع عن العقیده والشریعة ضد مطاعن المستشرقین**'، '**الاسلام المفتریٰ علیه**'، '**الاسلام والاستبداد السیاسی**'، '**الاستعمار أحقاد وأطماع**'، '**فی موکب الدعوة**'، '**حقیقة العربیة**'، **کیف نتعامل مع القرآن** ' وغیرہ زیادہ اہم ہیں- ان میں سے کئی ایک دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں-

اس وقت شیخ محمد الغزالی کی تصوف وسلوک سے متعلق ایک نہایت ہی معرکہ آرا کتاب **الجانب العاطفی من الاسلام-بحث فی الخلق والسلوک والتصوف** ،(ناشر نہضۃ مصر-اشاعت ۲۰۰۵ء بار سوم) میرے پیش نظر ہے- کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے- اس میں شیخ محمد الغزالی نے تصوف کی تعریف و تحقیق، حمایت و مخالفت یا تاریخ وتشریح سے بحث نہیں کی ہے بلکہ تصوف کو اسلام کے ایک باطنی اور اخلاقی ونفسیاتی پہلو تسلیم کرتے ہوئے، اس حوالے سے جو اسلام کی خاص تعلیمات ہیں ان کو اپنے مخصوص ادیبانہ ومفکرانہ لب و لہجے میں بیان کر دیا ہے، زبان شستہ، بیان دل پذیر اور اسلوب جدید ذہن کو اپیل کرنے والا ہے-

اشاعت اول کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد الغزالی تصوف کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک جس کا تعلق فلسفے سے ہے جب کہ دوسرے کا تعلق اسلام کی خالص تعلیمات سے ہے، وہ فلسفۂ تصوف کے سخت مخالف ہیں، بلکہ اسے اسلام کے خلاف ایک پرفریب ثقافتی جنگ کا نام دیتے ہیں، جس کا مقصد مسلمانوں کو ان کے عقائد و اہداف اور طریق مستقیم سے منحرف کرنا ہے- ان کے الفاظ ہیں:

''فلسفیانہ تصوف ہماری علمی تاریخ میں ایک قسم کا پرفریب ثقافتی حملہ ہے جس کا مقصد ہمیں اپنے عقائد و مناہج اور اہداف سے منحرف کرنا ہے- اہل علم کو اسے ضروری طور پہ سمجھنا چاہیے اور انہیں امت مسلمہ کو اس کے مکر وفریب اور اثرات سے متنبہ کرنا چاہیے، کیوں کہ اس کی اشاعت سے اسلام دشمنوں کا مقصد یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک بے مقصد و بے حوصلہ قوم بن جائے، ایک پریشان حال اور سست قوم، جس

☆zishanmisbahi@gmail.com

کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے کوئی تعلق نہ ہو، جو آیات واحادیث میں تاویل کرے اور الفاظ کے صحیح مفاہیم کو اپنے خیالات واوہام کے ذریعے بدل کر رکھ دے۔'' (ص:۳)

لیکن اس کے برخلاف وہ اسلامی تصوف کو جی جان سے قبول کرتے ہیں اور نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس لفظ کو جو حضرات اسلامی روایت میں ایک نیا لفظ قرار دے کر اسے رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو لفظی بحث سے بالاتر ہو کر حقیقت تصوف کی طرف آنے کی دعوت دیتے ہیں اور الفاظ کے گورکھ دھندے سے نجات کے لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اصطلاحات ہیں اور ہر شخص اپنی اصطلاح بنانے کے لیے مجاز ہے۔ فرماتے ہیں:

''رہا اسلامی تصوف تو اس کی بات ہی الگ ہے۔ بسا اوقات بعض حضرات کو یہ لفظ ناگوار گزرتا ہے لیکن جب مفہوم پر متفق ہیں تو پھر الفاظ پر جھگڑنا میں پسند نہیں کرتا۔ بعض نے اسی کو علم القلوب کا نام دیا ہے، بعض حضرات اسے علم الاحسان کہتے ہیں، جس کے دو مقامات ہیں، مشاہدہ اور مراقبہ، بعض ماہرین اخلاق ونفسیات اسے **علم البواعث علی الاعمال** سے موسوم کرتے ہیں جب کہ میں اسے **الجانب العاطفی من الاسلامی** (اسلام کا داخلی پہلو) کہنا پسند کرتا ہوں اور قدیم مقولہ ہے: **لامشاحة فی الاصطلاح** (اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں۔)'' (ص:۳)

شیخ محمد الغزالی عصر حاضر میں اسلامی تصوف یا اسلام کے جانب عاطفی کی اشاعت ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب اسی مقصد کے تحت سامنے آئی ہے۔ اس مقصد عظیم کی ضرورت اور اس کی کامیاب پیش کش میں اہل اسلام کی ناکامی کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ارباب دانش کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نئی تہذیب نے انسان کو آسمان سے کاٹ کر زمین سے باندھ دیا ہے۔ اس کے دل کو دنیاوی مسائل میں الجھا دیا ہے اور آخرت کے مقاصد سے اسے غافل کر رکھا ہے۔ وہ انسان کو اللہ سے دور لیے جا رہی ہے۔ یعنی اس کا رخ مکمل دین مخالف سمت پر ہے۔ اس تہذیب کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ ان دین پسندوں کا بھی ہے جو دستور الٰہی کو قلب ونظر کو مطمئن کرنے والے اسلوب میں دنیا وآخرت کی ضمانت، جسم وروح کی ضرورتوں کا مداوا اور دین ودنیا کے کفیل کے طور پر پیش کرنے میں ناکام ہیں۔ ہم مسلمانوں کے پاس اس میدان کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ میٹریل ہے۔ ہماری تاریخی میراث میں اس حوالے سے کافی وشافی مواد موجود ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ادراک وافادہ کا احساس ہو۔ دین صرف خشک احکام کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ بے جان فرامین کا نام ہے۔ یہ تو شوق ورغبت سے لبریز ایک دل ہے جو دین دار شخص کو حق تعالیٰ کی طاعت کی طرف انگیز کرتا ہے اور وہ یہ پکارتے ہوئے آگے بڑھتا ہے: مولیٰ! میں تیری رضا کے لیے بھاگا آ رہا ہوں **وعجلت الیک رب لترضی** (طہ:۸۴) (ص:۴)

الغزالی اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں اپنی علمی وراثت کے ایک گراں مایہ پہلو کا احیا کیا گیا ہے، جس کی معاصر زندگی کو ضرورت ہے۔ اگر وہ اس پہلو سے اغماض برتتی ہے تو وہ زمین وآسمان کی برکتوں سے محروم ہو جائے گی اور اس سے دور صرف زمینی سفلی مقاصد کی طرف بڑھتی چلی جائے گی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسلامی مفاہیم کو ضبط تحریر میں لے آؤں اور انہیں نئی نسلوں سے قریب کروں۔ میرا اولین مطمح نظر حمایت اسلام کے لیے عصر حاضر کے مطلوبات کو ہمارے پاس موجود وافر روحانی معانی سے جوڑنا تھا، تاکہ تمام تر عصری مطالبے مستحکم داخلی قوت کے ذریعے پورے ہوں، جن کے ساتھ حق زندہ رہے اور آگے بڑھے۔'' (ص:۴)

شیخ الغزالی کے اس اقتباس سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے روحانی پہلو کو یا دوسرے لفظوں میں اسلامی تصوف کو موجودہ دنیا کے مسائل ومصائب کو حل کرنے کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ وہ اسلام کی پیش کش اس کے تمام تر روحانی پہلوؤں کے ساتھ ضروری قرار دیتے ہیں اور موجودہ مطالبات کو اسلامی روحانیت سے مربوط کر دینا چاہتے ہیں۔ حق کی بقا اور سرخروئی کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری راہ کم از کم ان کی نظر میں نہیں ہے۔

شیخ الغزالی اشاعت اول کے مقدمے کا اختتام اپنے ان جملوں سے کرتے ہیں:

''میں تصوف کو اس کے گوشۂ نامی یا اس کی خانقاہ سے باہر لایا ہوں، تاکہ وہ محرک طاقت بن سکے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ میری اس تحریر کو شرف قبول بخشے اور میں اس سے اس بات کا سوالی ہوں کہ وہ اسے میرے میزان حسنات میں شامل فرمائے۔''

یہ جملے واضح کر رہے ہیں کہ الغزالی کے مطابق تصوف جمود وفرار کے اسباق نہیں، جیسا کہ بعض حضرات کا ماننا ہے، بلکہ اگر اس کی عصری پیش کش ہو تو وہ ایک محرک طاقت اور انقلاب بن کر سامنے آسکتا ہے- تصوف خانقاہوں میں موجود مزارات کی چادروں اور بتاشوں کا نام نہیں ہے بلکہ تصوف اس زندگی کا نام ہے جس سے موجودہ قلب و دماغ خالی ہیں- وہ ایک روح ہے جس کے بغیر مسلمان بلکہ انسان بے جان جسم ہیں- الغزالی نے جن مقاصد کے تحت یہ کتاب لکھی ہے اس میں وہ صد فی صد کامیاب ہیں- انہوں نے معاصر نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی روحانیت کو ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر حقیقت دین روشن ہو جاتی ہے، زندگی میں روح پیدا ہوتی ہے، مضمحل ارادے عزم جواں ہوتے ہیں، فکر کو توانائی، قلب کو صالحیت، طبیعت کو شرافت اور آدمی کو انسانیت کے اقدار گراں مایہ کا احساس ہوتا ہے- الغزالی کی یہ کتاب آج کے پریشان فکر نوجوان کو جینے کا حوصلہ دیتی ہے، اسے زمین پر رہتے ہوئے آسمان سے مربوط کرتی ہے، شخصی آزادی کے ساتھ سماجی احترام سکھاتی ہے اور ذات کو کائنات کے لیے نفع بخش بنانے کے گر سکھاتی ہے اور یہی تصوف ہے، اسی کی صوفیہ دعوت دیتے رہے ہیں، اسی کے فقدان سے آج انسانیت انسانوں سے رخصت ہوئی ہے، اقدار پامال ہوئے ہیں اور انسان حیوان زر بن چکا ہے- الغزالی نے تصوف کے اس درس کو نہ صرف اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا ہے بلکہ اس کے لیے بیشتر انہی الفاظ واصطلاحات کا سہارا لیا ہے جن کو قدیم صوفیہ استعمال کرتے رہے ہیں- الغزالی کی اس کتاب کو میکدۂ تصوف کا بادۂ کہنہ در جام نو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا-

''تصوف ہماری اسلامی ثقافت کا ایک حصہ ہے جو توجہ اور تحریک کا متقاضی ہے' ھذا جزء من ثقافتنا الاسلامیة یستحق البعث و العنایة اس جملے سے مقدمے کا آغاز ہوتا ہے- مقدمے میں الغزالی نے لکھا ہے کہ اسلام کے دیگر شعبوں پر بہت زیادہ کام ہوا اور اس کے باطنی پہلو پر کم کام ہوا، اسی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ گمان بھی ہو گیا کہ وہی بعض شعبے مکمل اسلام ہیں- الغزالی کے مطابق فقہ العبادات اور فقہ المعاملات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم مگر اسلام کا جو نفسیاتی او راخلاقی پہلو ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، لیکن افسوس کہ علما نے اس پہلو پر اتنا کام نہیں کیا جتنے کا یہ مستحق تھا- الغزالی سوال کرتے ہیں: ''مثلاً ہم وضو کے متعلق بڑی بڑی کتابیں لکھتے ہیں اور اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع کرتے ہیں، لیکن اس طرح کی علمی کتابیں اخلاص، توکل، تقویٰ، اعانت، صبر اور محبت کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے ؟ جب کہ اللہ جل جلالہ کی محبت، اس کے لیے اخلاص، اس کی طرف رجوع، اس پر توکل اور اس کے لیے صبر، یہ ایسے معانی ہیں جو ایمانیات میں سرفہرست ہیں یا ایمان کے رکن رکین ہیں- مستند تفاسیر کے مطابق اور تفصیلی شرح وبیان کے ساتھ ان کو رقم کرنا اسلام کی عظیم خدمت ہے بلکہ میں یہ کہوں کہ عبادات ومعاملات جو ظاہری اعمال ہیں، اس وقت تک نامکمل اور نامقبول رہیں گے جب تک ان کے اندر یہ باطنی معانی پیوست نہ ہوں اور دلوں میں جگہ نہ کر لیں''(ص:٦)

شیخ محمد الغزالی کی بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ عصر حاضر میں فقہ العبادات اور فقہ المعاملات کی تدریس سے زیادہ تربیت احوال باطن کی ضرورت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج جدید مدنیت وثقافت کی تعلیمات مختلف راستوں سے نئی نسل کے ذہن ودماغ پر اس تیزی سے چھاتی چلی جاری ہیں کہ اگر ہم اسلامی اخلاقیات وروحانیت پر نئی نسل کی تعمیر نہیں کرتے ہیں تو وہ جدید ثقافت کا شکار ہو جائے گی اور اس کے ایمان سوز حملے سے جان بر نہ ہو سکے گی-

شیخ محمد الغزالی نے مقدمے میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ وہ اس بات سے غافل نہیں ہیں کہ تصوف کی قدیم کتابوں میں انسان کے تعلق باللہ اور تعلق بالناس پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اور اس موضوع پر قدیم کتابوں میں وافر مواد جو موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس موضوع پر از سر نو کام کرنے کو وہ ضروری سمجھتے ہیں- انہوں نے ان کتابوں کو ''ادبا کے مقالات اور شعرا کے جذبات'' سے قریب بتایا ہے- ان کے نزدیک وہ کتابیں جدید ذہن کو اپیل کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں- اس لیے وہ اس موضوع پر جدید اسلوب میں مزید لکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں-

شیخ محمد الغزالی نے تصوف کی پرانی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کوئی مثال پیش کیے بغیر یہ بات کہی ہے کہ ان کتابوں میں بہت سے اغلاط اور خلاف واقع باتیں بھی در آئی ہیں- اس لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ تصوف پر از سر نو لکھا جائے لیکن آگے بڑھنے سے قبل ایک

بڑی منصفانہ بات کہہ دی ہے تاکہ ارباب تصوف کی دل آزاری نہ ہو اور بات متوازن ہو جائے، فرماتے ہیں:

''باوجود اس کے کہ ہماری ثقافتی روایت میں اغلاط صرف کتب تصوف تک محدود نہیں ہیں گو کہ ان کتابوں میں اغلاط زیادہ ہیں، بلکہ کتب تفسیر، کتب فقہ اور کتب سیرت میں بھی بہت سی اغلاط در آئی ہیں اور ان کی بڑی بڑی کتابوں میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جو اللہ ورسول کو اذیت پہنچانے والی ہیں۔''

اپنے مقدمے میں خصوصیت کے ساتھ دو قسم کے لوگوں پہ الغزالی نے سخت افسوس اور دکھ کا اظہار کیا ہے اور کہا کہ یہ دونوں گروہ مجھ سے شاکی ہے۔ ان دونوں گروہوں کا ذکر دلچسپی کا باعث ہے اس لیے ہم انہیں الغزالی کے الفاظ میں ہی لکھتے ہیں:

''ایک گروہ وہ ہے جو اپنے دل میں جذبۂ گرم، اللہ کے لیے شوق فراواں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حب شدید کا احساس رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ کتاب وسنت کے احکام پر اس کی نظر بہت کم ہے، ان میں سے وہ تھوڑی باتوں سے واقف اور زیادہ باتوں سے جاہل ہے۔ اس کے خیال میں صرف اسے ہی اللہ ورسول کی محبت حاصل ہے اور دوسروں میں وہ بات نہیں پاتا اور وہ انہیں اس دولت سے محروم سمجھتا ہے۔

اور ایک گروہ وہ ہے جو اپنی عقل میں روشنی، علم میں وسعت اور کلام میں بلاغت پاتا ہے۔ اکثر احکام شرعیہ میں وہ درستگی پر پہنچا ہوا ہے، وہ مطلوبہ عبادات صحیح ڈھنگ سے ادا کرتا ہے، لیکن وہ سرد نفس، خشک طبع اور سخت دل ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو پائے اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرے اور اسے جو حق کا ادراک اور کتاب وسنت پر جو اس کی نظر ہے، اس کی وجہ سے اس کا تفوق واضح ہے۔'' (ص:۸)

شیخ محمد الغزالی کی اس مختصر عبارت سے بہت سے حقیقتیں سامنے آتی ہیں، جن پر لمبی گفتگو ہو سکتی ہے۔ شیخ محمد الغزالی مکمل اسلام کے لیے ظاہری احکام کی مکمل پاس داری کے ساتھ باطنی جذبے کی مکمل سچائی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے اسلام مکمل ہوتا ہے۔ کسی بھی ایک پہلو کو پکڑ لینا اور دوسرے سے بے نیاز ہو جانا سخت انحراف اور ضلالت ہے۔ ان کی نظر میں: ''کامل مسلمان وہ ہے جس کے قلب و ذہن ایک ساتھ روشن ہوں۔ جو صاحب بصارت وبصیرت ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اس کی فکر اس کے جذبے سے اس طرح ہم آہنگ ہو کہ یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان میں فائق کون ہے، اس کے جذبے کی سچائی یا اس کے شعور اور نہ یہ معلوم ہو کہ زیادہ تیز کون ہے، اس کے نفس تازہ کی گرمی، یا اس کی عقل دور رس کی حدت۔ یہ تمام صفات خود اسلام کی فطرت سے ماخوذ ہیں۔ یہ ایسا دین ہے جو اپنے عقاید کو عقلی صحت کی جہت سے ایسے فکری اصولوں پر استوار کرتا ہے جو علوم ریاضی مثلاً حساب اور جبر و ہندسہ کے بدیہیات کے مشابہ ہیں۔ اس دین کے عقلی اصول عام معاملات اور نو پیدا مشکلات و مسائل میں واضح ہیں۔ اور دوسری طرف اسلام دین عبادت ہے، ایسی عبادت جو دل کی سلامتی، اخلاص اور محبت وادب سے آراستگی اور ہوائے نفس، جنبہ داری اور فریب سے صفائی کے ساتھ تحقق پذیر ہوتی ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی سیرت دل ونگاہ کی بیداری کے حسن امتزاج اور ایک سفر میں دونوں کی مصاحبت کا بہترین نمونہ ہے۔'' (ص:۸)

سفر شریعت میں عقل وضمیر کی ہم سفری کو لازم قرار دینے کے بعد الغزالی نے ان مدعیان احوال کی مذمت کی ہے جو عقل کی پاسبانی اور شریعت کی پاس داری کو لازم نہیں سمجھتے۔ اسی طرح ان شریعت پرستوں اور عبادت گزاروں کا مذاق اڑایا ہے جن کا دل دولت اخلاص وتقویٰ سے خالی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک افسر کا دلچسپ اور عبرت آموز واقعہ نقل کیا ہے جو حب آل بیت کا دم بھرتا، اپنے ہاتھ میں تسبیح لیے پھرتا اور اپنے آپ کو واصلین میں گمان کرتا تھا۔ ایک بار ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں بشمول اس کے بڑے بڑے خطبا نے جوہر خطابت دکھائے۔ دوسرے دن اخبارات نے سب کے نام شائع کیے مگر ان کا نام کسی وجہ سے نہ چھپ سکا۔ بس کیا تھا، جیسے مارے غضب کے پاگل ہو گئے ہوں۔

الغزالی نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ ہر ''وہ جذبہ جس کی تائید اسلام کے اصول وفروع کی صحیح تفصیلات کی روشنی میں نہ ہو، اور ان پر پورے طور سے عمل ہو، اس جذبے کا عند اللہ کوئی وزن نہیں ہے۔ اسی طرح جذبے کی سچائی علمی مغالطے کے لیے عذر نہیں ہے اور نہ دین اللہ میں ہویٰ اور رائے سے کہنے کا جواز ہے۔ اسلام کے چشمے معروف اور متعین ہیں، صرف انہیں سے احکام مستنبط کیے جا سکتے ہیں، کسی شخص کو

اجازت نہیں ہوسکتی کہ وہ ان میں اضافہ کرے یا کمی کرے۔'' (ص:۱۰)

الغزالی نے قرآن کی تفسیر بالرای کی مخالفت کی ہے- متصوفہ کی ایسی تفسیر جو نہ ماثور و مسنون ہو اور نہ ہی اصول شرع اس کی تائید کرتے ہوں ،کو سخت مذموم سمجھتے ہیں- یہ فتنے کے دروازے کو کھولنا ہے اور شریعت کو بے امان کرنا ہے- اسی طرح اس بات پر بھی انہیں حیرت ہے کہ مفسرین عموماً آیات قرآنیہ کی لفظی تحقیق اور اعرابی مباحث تو پیش کرتے ہیں لیکن جو مغز قرآن ہے، دلوں کو مولیٰ سے جوڑنے اور ان کی قدر و قیمت کو متعین کرنے کے حوالے سے جو اسرار ہیں، انہیں کوئی نہیں چھیڑتا- متصوفہ اور ظاہر پرستوں دونوں پر طنز کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اور عجیب بات یہ ہے کہ ہم دو متضاد گروہوں کے بیچ ہیں- ایک گروہ وہ ہے جو زبان اور بلاغت کے قواعد بیان کرتا ہے اور بعض قریبی ظاہری احکام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہیں رک جاتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو قواعد کو توڑتا ہے، حدود سے تغافل برتتا ہے اور من مانی نکات آفرینی کے ذریعے قرآن پر حملے کرتا ہے، کیوں کہ اس کی نظر میں وہ نکات قلب میں رقت پیدا کرتے ہیں، وجدان کو صیقل کرتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی طرف لے جاتے ہیں-'' (ص:۱۳)

دونوں مقدمے کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے- کتاب تین نمایاں عنوانات کے ساتھ منقسم ہے جسے ہم باب بھی کہہ سکتے ہیں- پہلا **الاسلام والایمان والاحسان**، دوسرا **دعائم الکمال النفسی** اور تیسرا **اشارات الطریق** ، پھر ان کے تحت بہت سے ذیلی عناوین ہیں-

پہلا باب الاسلام والایمان والاحسان ''حدیث جامع'' کے ذیلی عنوان سے حدیث جبرئیل سے شروع ہوتی ہے- یہ اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ عام اہل علم ونظر کی طرح شیخ محمد الغزالی بھی حدیث جبرئیل میں وارد لفظ الاحسان کو تصوف کی اصل قرار دیتے ہیں- الغزالی نے حدیث جبرئیل کی تشریح میں بڑا لطیف نکتہ بیان کیا ہے:

ایمان درست ہوگا تو اس کا نتیجہ عمل کی شکل میں ضرور برآمد ہوگا-
اور عمل درست ہوگا تو یقینی طور پر وہ ایمان پر مرتکز ہوگا-
اور احسان درست ہوگا تو یقینی طور پر وہ ایمان راسخ اور عمل کامل کا ہی نتیجہ ہوگا-

اس کے بعد الغزالی نے ان لوگوں کا رد کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایمان سے اور ایمان اسلام سے جدا ہوسکتا ہے اور بالخصوص ان کا تعاقب کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ احسان کا حصول فرائض اور عقاید سے بے گانہ رہ کر بھی ممکن ہے- الغزالی ان تینوں امور کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں- ان کے مطابق جب ایمان کامل اور عمل صحیح کا تحقق ہوگا تو اس کے بعد لازمی طور پر مقام احسان حاصل ہوگا- انہوں نے قرآنی آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر لفظ ایک دوسرے کی جگہ پر بھی بولا جاتا ہے- اس کے بعد پھر انہوں نے الگ الگ ایمان، اسلام اور احسان کی تحقیق کی ہے- ایمان کے ضمن میں اسلام اور مسیحیت کے عقائد کا تقابل کیا ہے، الحاد کا رد بلیغ فرمایا ہے اور اسے علمی خرافات قرار دیا ہے- اسلام کی تحقیق میں شہادتین کا معنی بتادیا ہے، انسانی زندگی میں خطا ونسیان کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے اور اللہ کے حضور سپر انداز ہونے کے دائرہ کار کو متعین کیا ہے- الاحسان کی تشریح کے ضمن میں **الاحسان فریضة مکتوبة علی کل شیٔ** کے ذیلی عنوان کے تحت یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں احسان یعنی اس معاملے کو احسن طریقے سے برتنا لازم ہے- شیخ محمد الغزالی کا ماننا ہے کہ احسان کے بعد ہی کوئی شے مکمل ہوتی ہے- ایمان و اسلام میں تمامیت اور کمال وہ احسان ہے جس کا ذکر حدیث جبریل میں **ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ و ان لم تکن تراہ فانہ یراک** (عبادت اس طور سے کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو تو اس طور سے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) کے الفاظ سے آیا ہے- اس کیفیت کے بعد ہی ایمان اور اسلام مکمل ہوتے ہیں- زندگی کے ہر میدان کار میں اسی طرح کمال مطلوب ہے- آپ ڈاکٹر ہیں تو اس کے انتہائی تقاضوں کو پورا کیجیے- اس ضمن میں ایک انوکھی بات یہ کہی ہے کہ جو شخص جس میدان عمل میں ہے وہیں رہ کر اپنا کام پورا کررہا ہے تو گویا وہ درجۂ احسان پر ہے- الغزالی نے اس پر حیرت ظاہر کیا ہے کہ ڈاکٹر اپنا وقت تسبیح پڑھنے میں اور انجینئر تقریر جھاڑنے میں ضائع کریں- الغزالی کے مطابق ان کے لیے فرائض و واجبات کے بعد احسان یہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وکمال ادا کریں- یہی خدمت ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی ہے- اسی طرح اہل ثروت انفاق فی سبیل اللہ کی بجائے نفل پڑھیں اور علما وصلحا تعلیم ودعوت کی بجائے دوسرے امور خیر میں مصروف ہوجائیں، یہ احسان کے مطلوبہ

اصول کی خلاف ورزی ہے-

الاحسان کی تفصیل کے دوران الغزالی نے کہا ہے کہ عامۃ الناس پر غفلت وعیش کی چادر تنی ہوئی ہے، جس کو ہٹانے اور ان کے اوپر ان کے مقصد تخلیق کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے- وہ اس عمل کے لیے ذکر کو ناگزیر قرار دیتے ہیں- ان کے بقول ''کثرت ذکر کے بغیر درجۂ احسان کا حصول ممکن ہی نہیں ہے'' (ص:۷۲)

پھر استغراق فی اللہ اور ذکر کی دوسری صورتوں کو بیان کرتے ہیں- تفصیل وتحقیق کے بعد بطور خلاصہ لکھتے ہیں کہ ''الاحسان کی حدیث جبریئل میں جو تشریح کی گئی ہے وہ تشریح صرف اس شخص کا وصف نہیں بیان کر رہی ہے جو نماز کے لیے اپنے قدموں کو برابر کر رہا ہے اور اپنی زبان کو ذکر میں مشغول کر رہا ہے، بلکہ یہ ہر اس انسان کے وصف کا بیان ہے جو اللہ کے تمام احکام کو زندگی کے تمام شعبوں میں بجالاتا ہے- الاحسان کا دائرہ بہت وسیع ہے- اس کی حدیں انسانی زندگی میں گہوارے سے قبر تک کے تمام اعمال کو محیط ہیں-'' (ص:۷۸)

دوسرے باب **دعائم الکمال النفسی** میں انسان کے آسمانی رشتے کو اجاگر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس رشتے کے کمزور ہونے سے انسان کس طرح عام جانوروں کی طرح بنتا چلا جا رہا ہے- الغزالی کے بقول مادیت انسان کو پستی کی طرف لیے جا رہی ہے- اس ضمن میں انہوں نے تہذیب مادی کے خوب صورت پروردوں کی مثال اس جانور سے دی ہے جسے سدھا کر مانوس کر لیا جاتا ہے اور وہ اپنے مالک کے اشارے پر بعض فرماں برداریاں کر دیا کرتا ہے اور اس کا مالک اسے سجا سنوار کر رکھتا ہے- الغزالی اہل ایمان کو جادۂ مستقیم پر گام زن رہنے کے لیے جہاد بالنفس کی دعوت دیتے ہیں- فرماتے ہیں ''نفس کی تہذیب وتزکیہ عقل کو صیقل اور روشن کرنے جیسا یا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے-'' (ص:۱۰۴) اس سلسلے میں انہوں نے ایک قیمتی اصول دیا ہے '' اس جہاد میں کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب ہوائے نفس کی مسلسل خلاف ورزی کی جائے اور صراط مستقیم پر پوری جرأت اور صبر کے ساتھ قائم رہا جائے-'' (۱۰۶)

اس کے بعد انہوں نے **اتباع الشہوات** کے عنوان کے تحت مادیت پرستوں کے نظریۂ آزادی اور شہوت پرستی کا رد کیا ہے اور اس شہوت پرستی کی تباہ کاریوں کو پیش کیا ہے- پھر ایک عنوان قائم کیا ہے **من تجارب المربیین** اور کتب تصوف سے استفادہ کرتے ہوئے شیخ ابن تیمیہ کے معاصر اور حریف صوفی ابن عطاء اللہ اسکندری کے اقوال کے تحت نفیس بحثیں کی ہیں- ہر قول کو پہلے ایک عنوان دیا ہے اور اس کے بعد پھر اس کی جدید لب ولہجے میں تفہیم وتشریح کی ہے- یہ عنوانات اس طرح ہیں: بے جا مشقت شہرت کی ہوس، اللہ کے حوالے، شیطان کا مکر، اپنے رب پر اعتماد کرو، لوگوں سے ناامیدی، کاملین کا نقص، اپنے نفس سے ڈرو، اللہ کے سامنے عاجزی، مادیت کے قیدی، عبودیت کی حقیقت، عابدین کی خطائیں، احسان صرف اللہ کا ہے، اپنی حقیقت سے غافل مت ہو، اپنے مالک کے حقوق کو پہچانو، زندگی ایک شغل ہے اور محاسبۂ نفس- الغزالی نے ان عنوانات کے تحت حضرت ابن عطاء اللہ اسکندری کے اقوال نقل کر کے ان کی بڑی نفیس تشریح وتوضیح اور عصر حاضر میں ان کی بڑی خوب صورت ودل پذیر تطبیق کی ہے- ''مادیت کے قیدی (**المحبوسون فی سجن المادۃ**) کے ذیل میں منکرین خدا اور غافلین خدا کو خالق کے وجود کے اقرار اور احساس کی دعوت دی ہے- اس ضمن میں یہ بات بھی آ گئی ہے:

''بعض فلاسفہ یا بعض متصوفہ کو آپ یہ کہتے پائیں گے کہ وہ ہر چیز میں خدا کو دیکھتے ہیں- یہ تعبیر درست ہے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہ خدا کے آثار وشواہد دیکھتے ہیں- لیکن اگر ان کی مراد خالق ومخلوق کا اتحاد ہو، یا وحدۃ الوجود ہو، جیسا کہ بعض جھوٹے کہتے ہیں تو یہ تعبیر الف سے یا تک باطل ہے اور یہ قول اللہ اور رسولوں کا انکار ہے-''

واضح رہے کہ وحدۃ الوجود کی مطلق حمایت یا مخالفت میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی، کیوں کہ ایمان وکفر کے مسائل میں یا احوال باطن کے مسائل میں معانی سے بے پروا الفاظ کو لے کر جنگ کرنا نہ تو دانش مندی ہے اور نہ ہی انصاف، میں نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ وحدۃ الوجود کو درست قرار دیتے ہیں ان کی مراد بھی درست ہوتی ہے اور جو اسے باطل قرار دیتے ہیں ان کی مراد بھی باطل ہوتی ہے- یعنی وحدۃ الوجود کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ وجود بالذات صرف ایک ہے تو اس کے ایمان ہونے میں اور اگر اس کے معنی خالق ومخلوق کا اتحاد لیا جائے تو اس کے کفر ہونے میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو- عموماً لوگ لفظی جنگ کرتے ہیں اور اس کے لیے تمام تر اسلحے استعمال کر ڈالتے ہیں-

—————— بقیہ صفحہ نمبر پر 45 ملاحظہ کریں

ڈاکٹر غلام زرقانی☆

علامہ ارشد القادری اور ''دعوت اسلامی''

قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری نے ۱۹۸۱ء میں کراچی (پاکستان) کا سفر کیا اور علامہ شاہ احمد نورانی کے دولت کدے پر اکابر علماے پاکستان علامہ سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبد الستار خاں نیازی، مولانا عبد المصطفیٰ ازہری، مفتی ظفر علی نعمانی، مفتی وقار الدین، مفتی شجاعت علی قادری، قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی وغیرہ کے سامنے اہل سنت کی عالم گیر دعوتی و اصلاحی تحریک ''دعوت اسلامی'' کا لائحۂ عمل پیش کیا اور پھر بعد میں مولانا الیاس عطار قادری صاحب کو اس دعوتی تحریک کا امیر مقرر کیا- موصوف علامہ کی امیدوں پر پورے اترے اور اس تحریک کو زمین کی وسعتوں میں پھیلا دیا- زمانہ گزرنے کے ساتھ حافظے سے یادیں محو ہونے لگیں اور اہل سنت کے محسن و قائد علامہ ارشد القادری کے اس احسان عظیم کا دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انکار کرنے کی باتیں سامنے آنے لگیں- حال ہی میں صاحبزادۂ رئیس القلم مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی کو علامہ کے ہاتھوں لکھا ہوا ''دعوت اسلامی'' کا مکمل دستور اور لائحۂ عمل ہاتھ لگا جسے انھوں نے حالیہ تازہ کتاب ''علامہ ارشد القادری اور دعوت اسلامی'' میں شائع کر دیا- اسی کتاب کا ایک خاص حصہ نذر قارئین ہے جو ''دعوت اسلامی'' کی دستور سازی اور بناکاری کے تعلق سے علامہ کی تاریخی خدمات سے روشناس کراتا ہے- (ادارہ)

دعوت اسلامی کی بنیاد: اس میں ذرہ بھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اہل سنت و جماعت کی ترقی وفلاح، استحکام ومضبوطی اور ترویج واشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا- اس حوالے سے جس محاذ پر بھی آپ کی عقابی نگاہوں نے کوئی کمی دیکھی، فوراً اس کے تدارک کے لیے کمر باندھ کر میدان عمل میں کود پڑے- یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جس کونے میں بھی آپ تشریف لے گئے، وہاں کی دینی ضرورتوں کے پیش نگاہ کوئی نہ کوئی تحریک ضرور چھیڑ دی- کبھی اہل سنت و جماعت کا ادارہ قائم کر دیا، کبھی علاقے کے لوگوں کے لیے مسجد کی بنیاد ڈال دی، کبھی وہاں کے فعال ومتحرک لوگوں پر مشتمل کسی انجمن کی داغ بیل ڈال دی اور کبھی لوگوں کی توجہ کسی ایسے امور کی طرف موڑ دی جس سے جماعت کی فلاح وبہودی کی راہ آسان ہو سکے- قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی کتاب زندگی کے اوراق چھاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ جہاں بھی گئے اپنی اسی فطرت ثانیہ کے ساتھ گئے- موضوع کی مناسبت سے ہم ان کے سفر کراچی کی روداد قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے-

کراچی کا تاریخی سفر: زندگی میں ویسے تو آپ نے احباب کی دعوت پر بارہا کراچی کا سفر کیا، لیکن سر دست یہاں پر صرف اس سفر پر گفتگو کی جائے گی، جس کا براہ راست تعلق دعوت اسلامی کے قیام کی تحریک سے ہے-

باوثوق اطلاعات کے مطابق قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے اگست ۱۹۸۱ء میں پہلی بار کراچی، پاکستان کا دورہ کیا- یہاں پہنچ کر آپ کا قیام جامعہ امجدیہ کراچی کے ایک حجرے میں ہوا- اس سفر سے قبل بیرونی ممالک میں اہل سنت و جماعت کی آواز زمین کی وسعتوں تک پہنچانے کے مقصد سے ورلڈ اسلامک مشن نامی عالمی تنظیم کے قیام میں بنیادی کردار ادا کرنے والوں میں آپ کی شخصیت نمایاں رہی تھی- جب کراچی پہنچے تو ایک ایسی تنظیم کا خاکہ ذہن وفکر میں چھایا ہوا تھا، جو دعوت واصلاح کے مدنی پیغام کو عملی سطح پر آبادیوں میں پہنچا سکے- قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی اس فکری جولانیت کی تصدیق کے لیے مسعود ملت پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمہ کی تحریر کا یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے:

''مبلغ اسلام حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی عالم اسلام کی جانی پہنچانی شخصیت ہیں- پاک وہند اور بیرونی دنیا میں مسلک اہل سنت و جماعت کی انہوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں- چند سال قبل دار العلوم امجدیہ کراچی میں ان سے پہلی بار شرف نیاز حاصل ہوا جب کہ وہ اہل سنت کے لیے ایک تبلیغی جماعت کا لائحۂ عمل تیار فرما رہے تھے- وہ دستور العمل آج دعوت اسلامی کے روپ میں ہمارے سامنے ہے- بے شک دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے-''

(حجاز جدید، ص:۵۰، شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ء)

☆Assist.Prof.Lone Star College,Houston,USA.ghulamzarquani@yahoo.com

قائد اہل سنت علیہ الرحمہ نے دعوت اسلامی کا دستور العمل بنانے کا تذکرہ اپنے اس مضمون میں بھی کیا ہے، جو غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد کاظمی کے حوالے سے ہے- تاریخی حقائق کے اجالے میں یہ عبارت پڑھیے:

''خدا کا شکر ہے کہ مجھے غزالی دوراں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمۃ والرضوان کی زیارت سے مشرف ہونے کا متعدد بار موقع ملا- پہلی بار حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کے دولت کدے پر اس تاریخی اجتماع میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس میں ''دعوت اسلامی'' کے نام سے اہل سنت کے ایک تبلیغی اور اصلاحی جماعت کی بنیاد رکھی گئی- اور جس میں پاکستان کے اکثر اکابر اہل سنت تشریف فرما تھے- ان کے سامنے مجھے ''دعوت اسلامی'' کا لائحۂ عمل پیش کرنا تھا، جسے میں نے استاذ العلماء حضرت علامہ عبد المصطفیٰ ازہری، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی وقارالدین رضوی اور رئیس الافاضل حضرت علامہ مفتی ظفر علی نعمانی کے اصرار پر مرتب کیا تھا- مفتی صاحب موصوف کی نظر میں لائحۂ عمل کی اتنی زبردست اہمیت تھی کہ انہوں نے مجھے اس کام کی تکمیل کے لیے دارالعلوم امجدیہ کے ایک کمرے میں کئی دنوں تک نظر بند کر دیا تھا-''

(شخصیات: از علامہ ارشد القادری، مرتب: ڈاکٹر غلام زرقانی، ص: ۹۷)

صد افسوس کہ کراچی کی سرزمین پر منعقد ہونے والی اس عظیم الشان تاریخی میٹنگ میں شریک ہونے والے اکثر اکابرین علمائے اہل سنت و جماعت اس دنیا میں نہیں رہے- کاش زندگی نے انہیں مزید مہلت دی ہوتی یا اس موضوع پر لکھنے کا خیال مجھے کچھ عرصہ پہلے آ گیا ہوتا تو ان اکابرین کی عینی شہادتوں پر مشتمل حقائق نامے کی ایک دستاویز اس کتاب کے ساتھ منسلک کی جا سکتی تھی- بہرکیف شرکاء میٹنگ میں سے جو چند علما اب بھی بقید حیات ہیں، ان میں جامعہ مہریہ کے بانی اور علامہ شاہ بندیالوی علیہ الرحمہ کے خاص شاگرد مولانا شاہ حسین گردیزی ہندو پاک کے علمی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں-

مولانا خوشتر نورانی مدیر اعلی ماہنامہ جام نور دہلی نے چند ماہ قبل ان سے ایک تفصیلی انٹرویو لیا تھا- دوران گفتگو ''دعوت اسلامی'' کی بنیاد وارتقا کے حوالے سے کیے گئے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بڑی دیانت داری اور صراحت کے ساتھ انہوں نے تاریخی حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہوئے فرمایا:

''یہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے، علامہ شاہ احمد نورانی صاحب نے مجھے اپنے گھر پر یہ کہہ کر مدعو کیا کہ آپ آئیں، دیگر علما بھی ہوں گے، وہاں کچھ باتیں ہوں گی- جب میں ان کے دولت کدے پر پہنچا تو وہاں حضرت شاہ احمد نورانی کے علاوہ علامہ عبد المصطفیٰ ازہری صاحب، علامہ احمد سعید کاظمی صاحب، مولانا شفیع اوکاڑی صاحب، علامہ ارشد القادری صاحب اور دیگر علما موجود تھے- وہاں پہلی مرتبہ میں نے علامہ ارشد القادری صاحب کو دیکھا، اس سے پہلے میں ان کی تصنیف ''زلزلہ'' پڑھ چکا تھا اور خاصا متاثر تھا- حضرت شاہ احمد نورانی صاحب کے گھر پر میٹنگ کا آغاز ہوا، جس میں سب سے پہلے علامہ ارشد القادری صاحب کھڑے ہوئے اور ایک عالمی تبلیغی تحریک ''دعوت اسلامی'' کا مکمل منصوبہ پیش کیا، موجودہ تحریک دعوت اسلامی میں آج جو اصطلاحات رائج ہیں انھیں پیش کیا، اس تحریک کا نام ''دعوت اسلامی'' بھی انہوں نے ہی رکھا اور ''اسلامی بھائی'' کی اصطلاح بھی انہوں نے ہی پیش کی- علامہ ارشد القادری صاحب کے اس منصوبے سے سبھی موجود اکابر علما و مشائخ نے اتفاق کیا اور اسے کافی سراہا- حضرت علامہ کے بعد علامہ احمد سعید کاظمی صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ''یہ فقیر دعوت اسلامی کا تبلیغی نصاب تیار کرے گا'' اس کے بعد علامہ عبد المصطفیٰ ازہری صاحب نے اس کی تائید و تحسین کی- مجھے یاد آتا ہے کہ اس وقت علامہ ارشد القادری صاحب نے کھڑے ہو کر ایک بڑی اہم بات کہی تھی کہ ''میں نے تبلیغی جماعت کے خلاف ایک کتاب لکھی ہے، لیکن اس کا صحیح جواب وہ نہیں ہے، اس کا صحیح جواب ''دعوت اسلامی'' نامی تحریک ہوگی''- اس کے علاوہ اور بھی کئی اہم باتیں ہوئیں-

اخیر میں علامہ شاہ احمد نورانی صاحب کھڑے ہوئے اور کہا کہ ''دعوت اسلامی'' کو میری پوری تائید و حمایت حاصل رہے گی، لیکن بظاہر میں اس سے دور رہوں گا، چونکہ میں یہاں حزب اختلاف میں ہوں اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دعوت اسلامی کے کاموں میں حکومت رخنہ انداز ہو- اس مجلس میں یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اس کا امیر کون ہوگا، بعد میں کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں- ہو سکتا ہے کہ علامہ ارشد القادری صاحب نے بعد میں یہ طے کیا ہو یا یہ کہ خود بڑھ کر مولانا الیاس قادری اس کے امیر بن گئے ہوں-''

(جام نور، ص:۴۲، ۴۳، شمارہ جون ۲۰۱۱ء)

دعوت اسلامی کے قیام کے حوالے سے جب علمائے کرام سے تبادلۂ خیال ہوا تو سبھوں نے اسے وقت کی اشد ترین ضرورت سے تعبیر کیا- اب چونکہ اس تحریک کی فکر قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کی تھی، اس لیے علمائے کرام نے آپ سے درخواست کی کہ اس کا دستور العمل بھی آپ ہی ترتیب دیں- چشم دید معتمد علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ کئی دنوں کی یکسوئی کے بعد جب قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے دعوت اسلامی کا دستور العمل مرتب کر لیا تو ورلڈ اسلامک مشن کے صدر علامہ الشاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ نے یکم ستمبر ۱۹۸۱ء کو اپنے دولت کدے پر ایک عشائیہ کا اہتمام کیا، جس میں پورے پاکستان سے اکابرین علمائے اہل سنت و جماعت اور ارباب حل وعقد نے شرکت کی -معمول کے مطابق وقت مقررہ پر میٹنگ کی کاروائی شروع ہوئی - دعوت وتبلیغ کی اہمیت وضرورت پر تبادلۂ خیال ہوا اور پھر آپ نے کھڑے ہو کر اپنا بنایا ہوا دستور العمل مجمع کو پڑھ کر سنایا- کئی مقام پر علمائے کرام نے اپنے مفید اور ضروری مشورے دیے جسے شکریے کے ساتھ قبول بھی کیا گیا- اس تاریخی میٹنگ کی رپورٹ بعض رسائل وجرائد میں بھی چھپی اور اہل سنت و جماعت کے عوام وخواص دونوں نے اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھا-

روزنامہ جنگ میں شائع شدہ رپورٹ: جیسا کہ ابھی گزرا اس تاریخی میٹنگ کی رپورٹ جلی حرفوں میں روزناموں اور رسائل وجرائد میں چھپی تھی- سردست روزنامہ جنگ کی رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

''لادینیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے
عالمی پیمانے پر تبلیغ کی ضرورت ہے
علامہ ارشد القادری، مولانا شاہ احمد نورانی اور علامہ عبد المصطفٰی ازہری
کا عشائیہ سے خطاب

کراچی، ۲ رستمبر: ورلڈ اسلامک مشن کے نائب صدر اور بھارت کے مشہور عالم اور ادیب علامہ ارشد القادری نے کہا کہ لادینیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے عالمی پیمانے پر تبلیغی وفود کی تیاری انتہائی ضروری ہے اور اس کے لیے دنیا کے تمام مسلمانوں کو متحد ومنظم ہو کر کام کرنا چاہیے- یہ بات انہوں نے گزشتہ شب ورلڈ اسلامک مشن کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کی جانب سے ان کی رہائش گاہ پر دیے گئے عشائیہ میں کہی-

علامہ قادری نے کہا کہ تبلیغ دین وقت کی اہم ضرورت ہے- اگر ہم نے اس سے روگردانی کی تو آنے والی نسلیں ہمیں معاف نہیں کریں گی- انہوں نے اس سلسلے میں عشائیہ میں شریک ملک کے ممتاز علمائے کرام کی توجہ مبذول کرائی اور کہا کہ مدرسہ، خانقاہیں اور مساجد کے ذریعہ بلاشبہ صحیح خطوط پر کام ہو رہا ہے، لیکن یورپ، افریقہ اور دیگر ممالک میں آج بھی تربیت یافتہ مبلغین کی سخت ضرورت ہے- انہوں نے کہا کہ ورلڈ اسلامک مشن اپنے طور پر پہلے ہی سرگرمی کے ساتھ تبلیغی خدمات سرانجام دے رہا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس کام کو منظم طریقے سے مزید پھیلایا جائے-

اس موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ ورلڈ اسلامک مشن کا قیام مکہ معظمہ میں عمل میں آیا اور اس کی پہلی عالمی تبلیغی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، جس میں عالم اسلام کے نمائندوں نے شرکت فرمائی-

اس موقع پر جماعت اہل سنت کے صدر علامہ سید احمد سعید کاظمی نے اعلان کیا کہ تبلیغی نصاب کی تیاری کے لیے وہ بھرپور تعاون کریں گے- علامہ عبد المصطفٰی ازہری نے اپنی تقریر میں کہا کہ عوام اہل سنت اس تبلیغی پروگرام کو کامیاب بنانے میں پورا تعاون کریں گے-

مولانا نورانی صاحب کے عشائیہ میں علامہ سید احمد سعید کاظمی، مولانا عبد الستار خاں نیازی، پیر طریقت صوفی محمد فاروق رحمانی، علامہ عبد المصطفٰی ازہری، مولانا مفتی ظفر علی نعمانی، مفتی وقار الدین، صاحبزادہ عبد التواب اچھروی، مفتی محمد حسین قادری، مولانا محمد حسن حقانی، مفتی غلام قادر کشمیری، مفتی شجاعت علی قادری، مولانا جمیل احمد نعیمی، مولانا شبیر احمد ازہری، مولانا محمد حسن قادری، مولانا قاری نثار الحق، مولانا قاری رضاء المصطفٰی اعظمی، صاحبزادہ ابو الخیر محمد زبیر، مفتی احمد میاں برکاتی اور مولانا محمد یوسف سمیت کثیر تعداد میں علمائے اہل سنت نے شرکت کی-''

(روزنامہ جنگ وروزنامہ نوائے وقت کراچی، ۳ رستمبر ۱۹۸۱ء)

دعوت اسلامی کے لیے امیر کا انتخاب: دعوت اسلامی کے قیام کے بعد علمائے کرام نے امارت کے منصب کے لیے کسی ایسی شخصیت کی تلاش شروع کر دی جو ایک تحریک کو کامیابیوں سے ہمکنار کر سکے- چونکہ یہ ایک نہایت ہی اہم منصب تھا، جسے عجلت میں کسی کو تفویض

کر دینا، جماعت کے حق میں نا قابل تلافی نقصان کا باعث ہو سکتا تھا- مصدقہ اطلاعات کے مطابق اسی طرح کی ایک مجلس میں قائد اہل سنت علیہ الرحمہ، علامہ عبد المصطفٰی از ہری علیہ الرحمہ، مفتی ظفر علی نعمانی علیہ الرحمہ، مفتی وقار الدین علیہ الرحمہ، قاری رضاء المصطفٰی اور پیر طریقت مولانا قاری مصلح الدین صدیقی علیہ الرحمہ نے کافی غور و خوض کے بعد حضرت مولانا محمد الیاس قادری صاحب کا انتخاب کیا-

اس میٹنگ کے ایک گواہ حضرت مولانا قاری رضاء المصطفٰی مدظلہ العالی امام و خطیب نیومیمن مسجد کراچی بھی ہیں- ان کی روایت کے مطابق یہ نشست جامعہ امجدیہ کراچی میں ہوئی تھی، جس میں شہر کے ذمہ دار علمائے کرام، ائمہ مساجد اور ذی اثر عمائدین اسلام جمع ہوئے اور سب کی موجودگی میں قائد اہل سنت علیہ الرحمہ نے مولانا الیاس قادری عطاری کے سر پر دستار امارت لپیٹی اور انہیں دعوت اسلامی کے فکری خاکہ کو محسوسات کی شکل میں زمین پر منتقل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی-

(مصنف کے ساتھ ذاتی گفتگو، ۵/دسمبر ۲۰۱۱ء، بوقت دو بجے شب)

''دینی نصاب'' کا تقاضا: ''دعوت اسلامی'' کے لائحۂ عمل میں آپ پڑھیں گے کہ تنظیم کے اجتماعات میں دعوت و اصلاح کے لیے جس کتاب کے درس دیے جانے کی ہدایت کی گئی ہے، اسے ''دینی نصاب'' کے نام سے موسوم کرایا گیا ہے- کراچی میں ہونے والی علمائے کرام کی نشست میں غزالی دوراں علامہ احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس کتاب کو ترتیب دیں گے، لیکن افسوس کہ ان کی عمر وفا نہ کر سکی اور وہ اس تنظیم کی بنیاد کے ٹھیک چار سالوں بعد ہی ۱۹۸۵ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے- اس طرح حضرت غزالی دوراں علیہ الرحمہ کے قلم سے اشاعت پذیر ہونے والی ''دینی نصاب'' کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا- آپ کے وصال کے بعد امیر دعوت اسلامی مولانا الیاس قادری عطاری نے حضور قائد اہل سنت علیہ الرحمہ سے ''دینی نصاب'' تصنیف کرنے کی اہمیت پر زور دیا- اس حوالے سے جو چند خطوط انہوں نے قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے نام لکھے ہیں، ان میں خصوصیت کے ساتھ دینی نصاب کی گزارش کی گئی ہے، بلکہ خط کے اختتام پر اپنے دستخط سے قبل بھی ''منتظر دینی نصاب'' نامی کلمات واضح طور پر مرقوم ملتے ہیں:

حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بفضلہ تعالیٰ بندہ خیریت سے ہے- رمضان المبارک میں مسلمانوں کے مذہبی جوش و لگن سے فائدہ اٹھانے کے لیے دعوت اسلامی کی جانب سے خصوصی پروگرام مرتب کیے گئے- یہ خصوصی پروگرام آخری عشرہ کا اعتکاف تھا- آپ کو یہ سن کر حیرت اور خوشی ہوگی کہ دعوت اسلامی کی تحریک کی بنا پر مرکز جامع مسجد گلزار حبیب میں ساٹھ افراد نے آخری عشرہ کا اعتکاف کیا جو کراچی شہر میں کسی ایک مسجد میں معتکفین کی سب سے زیادہ تعداد تھی-..........ان حالات کے پیش نظر میں آپ سے پھر یہ استدعا کرتا ہوں کہ براہ کرم جلد از جلد دینی نصاب کو مرتب کر کے روانہ کریں تاکہ دعوت اسلامی کی مقبولیت متاثر نہ ہو-

دینی نصاب کا منتظر

محمد الیاس قادری عفی عنہ

(یہ خط مصنف کتاب کی تحویل میں ہے جس میں تاریخ درج نہیں ہے-)

ایک دوسرے خط میں مولانا الیاس قادری مدظلہ العالی دعوت اسلامی کی سرگرمیوں کے حوالے سے گفتگو کرنے کے بعد درخواست کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی السلام علیکم

بندہ بفضلہ تعالیٰ خیریت سے ہے- دعوت اسلامی کے احوال عرض ہیں- اللہ اور اس کے رسول کے فضل و کرم سے دعوت اسلامی اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں ہے- اس وقت دعوت اسلامی نے پورے کراچی کو کوَر کر لیا ہے- تقریباً ۳۰۰ مساجد میں دعوت اسلامی کے تحت ''مکاشفۃ القلوب'' کا درس دیا جا رہا ہے-

نتیجتاً عوام اہل سنت میں بیداری کی عام لہر دوڑ گئی ہے اور سنی قوم جو ایک طویل عرصے سے اپنے پلیٹ فارم کی متلاشی تھی دھڑا دھڑ دعوت اسلامی کے قافلے میں شامل ہو رہی ہے- ضلع کراچی کا مرکزی اجتماع بڑی سادگی لیکن بھرپور انداز پر شہر کے وسط میں واقع جامع مسجد گلزار حبیب میں ہر جمعرات کو منعقد ہو رہا ہے، جس نے سینکڑوں غافلوں کی زندگیوں میں انقلاب عظیم بپا کر دیا ہے- اب دعوت اسلامی کی تحریک کراچی سے باہر نکل چکی ہے اور اندرون سندھ ضلع بدین اور کھوسکی کی ۱۷ میں سے ۱۵ مساجد میں سلسلہ درس اور ضلعی مرکزی اجتماع شروع ہو چکا ہے- حال ہی میں حیدرآباد میں کراچی سے تقریباً سوا افراد پر مشتمل

ایک قافلہ گیا تھا- اس دورے کے نتیجے میں حیدرآباد کی کئی مساجد مین سلسلہ درس شروع ہوگیا ہے- دعوت اسلامی کی اس تحریک کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے رمضان المبارک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے دارالعلوم امجدیہ میں مفتی ظفر علی نعمانی، مفتی وقارالدین وغیرہ کے بھرپور تعاون سے پاکستان بھر سے آئے ہوئے علمائے کرام کا ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں دعوت اسلامی، اس کے طریقہ کار اور کراچی میں اس کی زبردست کامیابیوں سے متعارف کرایا گیا اور ہر علاقے میں دعوت اسلامی کے کام کو شروع کرنے پر زور دیا گیا- اس اجلاس کا بڑا ہی اچھا نتیجہ نکلا- پاکستان بھر سے آئے ہوئے علمائے کرام نے دعوت اسلامی کی پکار پر لبیک کہا اور ان شاء اللہ بہت جلد بلوچستان، سرحد، پنجاب اور سندھ میں دعوت اسلامی کا کام بھرپور انداز میں شروع ہوجائے گا-

آپ کام کی وسعت کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ ہم ابھی تک تقریباً ۵۰۰ مکاشفۃ القلوب مساجد میں سلسلہ درس کے لیے کراچی اور مختلف اضلاع میں تقسیم کرچکے ہیں اور مانگ اس قدر ہے کہ کتاب مارکیٹ میں شارٹ پڑگئی اور ہمیں مجبوراً اپنے کام کو جاری رکھنے کے لیے ۲۴۰۰۰ کے صرفہ سے ایک ہزار کتابیں چھپوانی پڑیں جو مساجد میں سلسلہ درس شروع کرنے کے لیے دعوت اسلامی کی جانب سے مفت تقسیم کی جارہی ہیں اور حالات وسعت ایسے ہیں کہ یہ کتابیں بھی کم پڑ جائیں گی-

حضرت! یہ ہے صورت حال! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ''دینی نصاب'' کے خلا کو پر کرنے کے لیے عارضی طور پر ہم نے مکاشفۃ القلوب کو رائج کیا تھا، جو ایک اچھی کتاب ہے، لیکن دعوت اسلامی کے مقاصد سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہیں اور نہ ہی یہ کتاب دعوت اسلامی کے مطلوبہ ذہن تیار کرسکتی ہے- دعوت اسلامی کے مقاصد سے ہم آہنگ اور اس تحریک کے لیے مطلوبہ ذہن صرف ''دینی نصاب'' ہی پیدا کرسکتی ہے، لیکن افسوس کہ اس کتاب کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں- مطلوبہ لٹریچر کے اس خلاء کی وجہ سے ہمیں بڑی پریشانی کا سامنا ہے اور اب بھی یہ کتاب منظر عام پر نہ آئی تو دعوت اسلامی کی رفتار وسعت سست پڑ جائے گی ....ان حالات کے پیش نظر حضرت آپ اپنی دیگر تمام مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر جلد از جلد اس کتاب کو ترتیب دے کر ہمیں روانہ کریں-

''دینی نصاب'' کا منتظر

محمد الیاس قادری

(یہ خط مصنف کتاب کی تحویل میں ہے، جس میں تاریخ درج نہیں ہے-)

''دعوت اسلامی'' کی حمایت: اب ذرا دل تھام کر اس افسوسناک حادثہ کی روداد بھی سنتے چلیے کہ جس کے گواہ دارالعلوم غوثیہ رضویہ، سہارنپور کے کئی علمائے کرام ہیں- اس واقعہ کے ذیل میں جہاں ایک طرف اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ نے دعوت اسلامی کی حمایت ونصرت کی ہے، وہیں دوسری طرف یہ بات بھی خود انہی کی زبان سے واضح ہوجاتی ہے کہ تحریک دعوت اسلامی انہی کے اخاذ ذہن وفکر کی پیداوار ہے-

''یہ واقعہ ۲۰۰۰ء کا ہے، قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ باحیات تھے اور اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہے تھے، اس وقت وہ حکیم سید محمد احمد صاحب کے زیر علاج تھے اور اس سلسلے میں انہی کے ادارے جامعہ غوثیہ رضویہ پیروالی گلی سہارنپور میں فروکش تھے، اس ادارے کی سرپرستی خود حضرت علامہ کیا کرتے تھے اور انہی کی تحریک پر سنیت کی اشاعت کے لیے بدمذہبوں کے درمیان یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا- وہاں قیام کے دوران سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کے ۷۸۶واں سالانہ عرس کی تاریخ آگئی اور ادارے میں ایک بڑی محفل کا انعقاد کیا گیا، جس میں شہر کے سیکڑوں خوش عقیدہ افراد نے بھی شرکت کی- اس روحانی محفل کے اختتام کے بعد اچانک ایک شخص اٹھا اور دعوت اسلامی کی مخالفت میں ایک کتابچہ بعنوان ''ایمان کی حفاظت کیسے کریں؟'' تقسیم کرنے لگا، روحانیت کی ایسی محفل میں اس بدمزگی سے لوگ حیران وپریشان چہ می گوئیاں کرنے لگے، ماحول زیادہ خراب اور کشیدہ نہ ہوجائے یہ سوچ کر مولانا مجیب الرحمٰن علیمی (استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد) جو اس وقت ادارے کے طالب علم تھے اور ان کے کچھ ساتھی اس کتابچے کو لے کر دوڑتے ہوئے حضرت علامہ کے پاس پہنچے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا- حضرت نے کتابچہ دیکھتے ہی غصے سے فرمایا کہ ''جاؤ! اسے فوراً روکو اور پکڑ کر میرے پاس لاؤ-'' طلبہ نے حکم کی تعمیل کی اور اس شخص کو حضرت کے روبرو لا کھڑا کیا، اس شخص سے جب اس کا نام اور اتا پتا پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ بریلی کا رہنے والا کوئی سعید حسن انجینئر ہے- یہ سنتے ہی حضرت کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا اور اس کی اس مذموم حرکت پر حضرت نے اسے

خوب ڈانٹا پھٹکارا- وہاں کے جو اساتذہ مثلاً مولانا عبدالقیوم صاحب، مولانا غلام غوث مصباحی صاحب، مولانا اشتیاق صاحب وغیرہ اور جو طلبہ موجود تھے وہ بتاتے ہیں کہ حضرت اس شخص کو ڈانٹتے ڈانٹتے درد و کرب سے زار و قطار رونے لگے اور فرمایا کہ: ''اگر مولانا الیاس قادری عطاری یا تحریک دعوت اسلامی بدعقیدہ اور وہابی تحریک ہے تو میں بھی ہوں، کیوں کہ مولانا الیاس قادری کو امارت تفویض کرنے اور دعوت اسلامی کی تشکیل میں میرا ہی ہاتھ ہے-'' پھر اسے اہل سنت میں انتشار وافتراق سے باز رہنے کی سختی سے تلقین فرمائی اور اہل سنت کے مابین اتحاد واتفاق کی بنیاد پر مثبت اور تعمیری کام کرنے کا مشورہ دیا-

(ماہنامہ جام نور، دہلی، شمارہ مئی ۲۰۱۰ء، ص:۵)

ہو سکے تو اس عبارت کو دوبارہ پڑھیے کہ ''مولانا الیاس قادری عطاری یا تحریک دعوت اسلامی بدعقیدہ اور وہابی تحریک ہے تو میں بھی ہوں، کیوں کہ مولانا الیاس قادری کو امارت تفویض کرنے والا اور دعوت اسلامی کی تشکیل میں میرا ہی ہاتھ ہے-'' اس اعتراف حقیقت کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ دعوت اسلامی کے قیام کے حوالے سے ہر قسم کے شبہات دور کر دینے والی یہ نہایت ہی واضح، صاف وشفاف اور چشم کشا عبارت ہے-

مولانا اقبال احمد فاروقی صاحب کا بیان: پیرزادہ مولانا اقبال احمد فاروقی صاحب نے اپنے مشہور ومعروف مجلّہ ''جہان رضا'' کا ''دعوت اسلامی'' نمبر شائع کیا ہے- یہ نمبر عالمی سطح پر دعوت اسلامی کی کامیابی اور اس کے تنظیمی خاکہ پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے- مذکورہ بالا مجلّہ کے اداریہ کی ابتدا میں آپ قائد اہل سنت علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے ہندوستان کے ایک عالم دین رئیس القلم علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ ہندوستان سے پاکستان تشریف لائے- لاہور کے مقتدر علمائے اہل سنت نے ان کے اعزاز میں ایک زبردست استقبالیہ دیا- جس میں انہوں نے نہایت دلسوزی کے ساتھ دیوبندیوں کی ''بستر بند تبلیغی جماعت'' کی ہندوستان میں بداعتقادی وجارحیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حضرات علمائے اہل سنت! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک پاک ملک دیا ہے، جس میں دین کے لیے کام کرنے کے بڑے مواقع موجود ہیں-''

(جہان رضا، دعوت اسلامی نمبر، ص:۱۱، شمارہ اپریل ۲۰۱۱ء)

یہاں تک تو تمہید تھی جس سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے نہاں خانۂ دل میں کسی ایسی تنظیم کے قیام کی فکر پرورش پا رہی تھی جو دنیا کو لادینیت اور عقیدہ وعمل کی گمراہی سے بچا سکے- آگے چل کر مولانا فاروقی لکھتے ہیں:

''مولانا ارشدالقادری نے جہاں لاہور کے علمائے اہل سنت کو ''دعوت اسلامی'' کے لیے جمع کیا وہاں کراچی میں بھی علمائے اہل سنت کو جمع کیا-'' (جہان رضا، دعوت اسلامی نمبر، ص:۱۱، شمارہ اپریل ۲۰۱۱ء)

معروضہ: اسی مجلّہ کے آخری صفحات پر میں نے ''دعوت اسلامی'' کے قیام وبنا کے حوالے سے حضرت مولانا الیاس قادری عطاری مدظلہ العالی کی ایک تحریر دیکھی- اس میں آپ نے قائد اہل سنت علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ کی تحریک پر علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کے دولت کدے میں ہونے والی میٹنگ کا تذکرہ تو واقعی کیا ہے، لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے سنار کو انگوٹھی بنانے کا حکم کرنے والے کو 'بانی' نہیں بلکہ سنار ہی کو 'بانیٔ انگوٹھی' قرار دیا جائے گا کہ 'انگوٹھی' کا صرف نام لینے سے انگوٹھی بن نہیں گئی، بلکہ سنار نے جدوجہد کی تو ہی بنی-''

(نفس مصدر، ص:۱۸۹)

یہ عبارت میری ناقص سمجھ سے بالاتر ہے کہ اگر اسی فلسفۂ قیام وبنا کو تسلیم کر لیا جائے تو نہ ''تاج محل'' کا بانی شاہجہاں کو قرار دیا جا سکے گا اور نہ ہی ''لال قلعہ'' کا، بلکہ اس سے بڑی مصیبت تو ہم اہل ہند کو پیش آئے گی کہ یہاں مساجد کی تعمیر کے لیے جن مزدوروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، وہ زیادہ تر غیر مسلم ہوتے ہیں- لہٰذا اس فکر کو اگر بعینہٖ تسلیم کر لیا جائے تو پھر تعمیر مساجد کے حوالے سے ساری بشارتوں کے اہل وہ ہو جائیں گے-

آگے چل کر حضرت امیر اہل سنت مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ شہزادۂ صدرالشریعہ علامہ قاری رضاء المصطفیٰ مدظلہ العالی نے یہ پیغام دیا کہ قائد اہل سنت علامہ ارشدالقادری علیہ الرحمہ یاد فرما رہے ہیں تا کہ انہیں دعوت اسلامی کا امیر بنایا جا سکے- یہ سن کر آپ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے پاس پہنچے اور آپ کو امیر بنا دیا گیا- اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ دعوت اسلامی کے حوالے سے:

''........نہ کوئی تنظیمی ڈھانچہ تھا نہ کوئی ٹھوس طریق کار.........''

(جہان رضا، دعوت اسلامی نمبر، ص:۱۸۷، شمارہ اپریل ۲۰۱۱ء)

اس عبارت سے مطلوب کیا ہے؟ یہ تو امیر اہل سنت ہی بہتر بتا سکتے ہیں، لیکن اگر اس سے مراد لائحۂ عمل ہے تو یہ بات میری سمجھ سے بالا تر ہے کہ ایک تحریک کو کامیابیوں سے ہمکنار کرانے کے لیے کئی شبانہ روز تک غور وخوض اور محنت ومشقت کے بعد ایک منظّم لائحۂ بنایا جائے اور جس کے لیے بنایا جائے اسے ہی نہ دیا جائے، جب کہ اس کی تیاری کے حوالے سے خود قائد اہل سنت علیہ الرحمہ نے غزالی دوراں حضرت علامہ سعید احمد کاظمی علیہ الرحمہ کے تذکرے کے دوران لکھا ہے کہ:

''اور جس میں پاکستان کے اکثر اکابر اہل سنت تشریف فرما تھے- ان کے سامنے مجھے ''دعوت اسلامی'' کا لائحۂ عمل پیش کرنا تھا- جسے میں نے استاذ العلماء حضرت علامہ عبد المصطفیٰ ازہری، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی وقار الدین رضوی اور رئیس الافاضل حضرت علامہ مفتی ظفر علی نعمانی کے اصرار پر مرتب کیا تھا- مفتی صاحب موصوف کی نظر میں لائحۂ عمل کی اتنی زبردست اہمیت تھی کہ انہوں نے مجھے اس کام کی تکمیل کے لیے دار العلوم امجدیہ کے ایک کمرے میں کئی دنوں تک نظر بند کر دیا تھا-''

(شخصیات، ص:۷۹)

اور اپنی جماعت کے معتمد قلم کار ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد علیہ الرحمہ کی تحریر کا یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے:

''مبلغ اسلام حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی عالم اسلام کی جانی پہچانی شخصیت ہیں- پاک وہند اور بیرونی دنیا میں مسلک اہل سنت وجماعت کی انہوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں- چند سال قبل دار العلوم امجدیہ کراچی میں ان سے پہلی بار شرف نیاز حاصل ہوا جب کہ وہ اہل سنت کے لیے ایک تبلیغی جماعت کا لائحۂ عمل تیار فرما رہے تھے- وہ دستور العمل آج دعوت اسلامی کے روپ میں ہمارے سامنے ہے- بیشک دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے-''

(حجاز جدید، ص:۵۰، شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ء)

اور اسی لائحۂ عمل کے حوالے سے علامہ شاہ حسین گردیزی کہتے ہیں:

''جس میں سب سے پہلے علامہ ارشد القادری صاحب کھڑے ہوئے اور ایک عالمی تبلیغی تحریک ''دعوت اسلامی'' کا مکمل منصوبہ پیش کیا-''

(جام نور، ص:۴۲، ۴۳، شمارہ جون ۲۰۱۱ء)

اخیر میں بعض ویب سائٹس پر دعوت اسلامی کے قیام وبنا کے حوالے سے جو تحریر نظر سے گزری ہے، اسے بھی پڑھتے چلیے:

"Mohammad Ilyas Qadri describes how the death of his older brother, and the burden of keeping his family intensified his religious sentiments, that he began to limit his circle of friends to those of a religious mindset. His close companions used to accompany him to recite Islamic litanies and naat at the grave˩ õside of his brother, which lead to a series of speeches delivered on various aspects of Islam. This grass roots movement took hold, through congregations consisting of speeches and dua's which eventually became the foundation of ' Dawat˩ õe˩ õIslami"(Murshidpiya.weekly.com)

ترجمہ: محمد الیاس قادری بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان کے بڑے بھائی کی موت اور گھریلو ذمہ داریوں نے ان کے مذہبی جذبات بیدار کیے کہ آپ کا حلقہ احباب مذہب پسند طبقہ تک محدود ہو کر رہ گیا- آپ کے قریبی دوست بھائی کی قبر کے پاس آپ کے ساتھ ساتھ اسلامی قصائد اور نعت پڑھتے، جس کے بعد مختلف موضوعات پر تقریریں ہوتیں- یہی ابتدائی بزم کہ جس میں تقریر اور دعا وغیرہ ہوا کرتی تھی، آخر کار آہستہ آہستہ دعوت اسلامی کے قیام کی شکل میں تبدیل ہو گئی-

اس بیان پر میں اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی موثوقیت کے حوالے سے کوئی حتمی اطلاع نہیں ہے- یہ الگ بات ہے کہ یہی لفظ بعینہ میں نے کئی دوسری ویب سائٹس پر بھی دیکھا ہے-

آخری بات: اب تک آپ نے ''دعوت اسلامی'' کی واقعی تاریخ کے مختلف گوشوں کو اکابر علمائے اہل سنت کی شہادت، اخبارات کی سرخیوں اور حقیقی واقعات کے ذیل میں ملاحظہ فرما لیا ہے- اتنے واضح دلائل وبراہین کی موجودگی میں یہ کہنا عدل وانصاف ہی کا تقاضا ہے کہ

موجودہ ''دعوت اسلامی'' کا خاکہ یقینی طور پر قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا عطا کردہ ہے اور اسی کے ساتھ یہ اعتراف کرنا بھی اخلاقی فریضہ ہے کہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کا سہرا بہر حال امیر اہل سنت مولانا الیاس قادری عطاری کے سر ہی بندھتا ہے۔

امیر دعوت اسلامی مولانا الیاس قادری مدظلہ العالی کی یہ انتھک محنت ومشقت ہی تھی کہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے ساتھ آپ کا تعلق بڑا ہی والہانہ ہوا کرتا تھا۔ اس تعلق وشفقت کی ایک جھلک دیکھنا ہو تو اس خط کا ابتدائی حصہ پڑھیے جسے امیر دعوت اسلامی مولانا الیاس قادری مدظلہ العالی نے لکھا ہے:

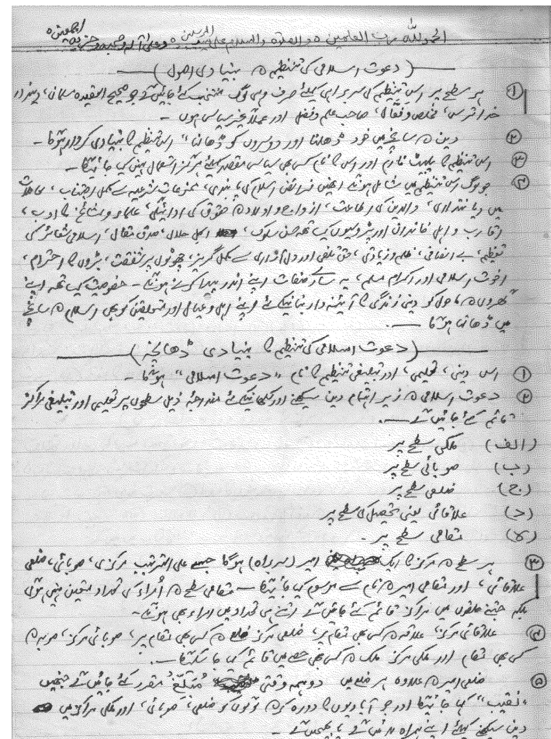
''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سگ مدینہ محمد الیاس عطار قادری رضوی عفی عنہ کی جانب سے عبد رب مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم، عاشق خیر الوریٰ صلی اللہ علیہ وسلم، محبّ صحابہ واہل بیت مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم، طالب نگاہ غوث وخواجہ رضی اللہ عنہما، فیضیاب فیضان امام احمد رضا رضی اللہ عنہ، استاذ العلما، زینت الفضلا حضرت علامہ مولانا رئیس التحریر ارشد القادری صاحب مدظلہ کی خدمت سراپا عظمت میں مکہ مکرمہ کی مشکبار فضاؤں اور مدینہ منورہ کی خوشبودار ہواؤں کی برکتوں سے مالا مال سلام

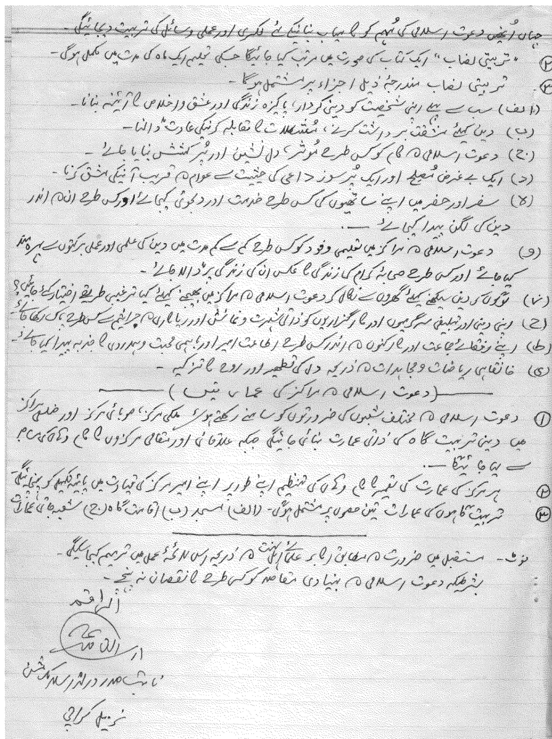
عالی جاہ! الحمدللہ علی احسانہ، آپ کی اکلوتی تحریک ''دعوت اسلامی'' بین الاقوامی سطح پر تیزی کے ساتھ نشو ونما پا رہی ہے۔ پاک وہند کے علاوہ بنگلہ دیش، نیپال، سیلون، برطانیہ، امریکا، روس اور جاپان وغیرہ ممالک میں اس کا کام ہو رہا ہے۔ نیز ماریشش او رقرب وجوار، علاوہ ازیں ڈربن، کینیا، دارالسلام، موزمبیک، پریٹوریہ، کمپالا وغیرہ میں اس کی بنیادیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ علاوہ ازیں عرب امارات، کویت، مسقط بلکہ عرب شریف میں مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، جدہ شریف، ریاض وغیرہ متعدد مقامات پر دعوت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماعات اور جابجا یومیہ درس فیضان سنت کا سلسلہ جاری ہے۔

۳/ذیقعدہ، ۱۴۱۸ ہجری، العربیۃ المتحدۃ''

آیئے دعا کریں کہ مالک کائنات اس تنظیم کے بانی، امیر اور ان سبھوں کو اجر عظیم عطا فرمائے جو اسے استحکام بخشنے کی سعی پیہم کر رہے ہیں۔ □□□

حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی اپنی تحریر میں ''دعوت اسلامی'' کے دستور کا پہلا اور آخری صفحہ۔ مکمل دستور کے مطالعے کے لیے ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب کی کتاب ''علامہ ارشد القادری اور دعوت اسلامی'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)





پیمائش

مبصر: ذیشان احمد مصباحی☆

نام مجلہ: نعت رنگ (شمارہ:۲۲)

مرتب: سید صبیح الدین صبیح رحمانی، **صفحات:** 560 **قیمت:** 300، **سال اشاعت:** 2011

ناشر: نعت ریسرچ سینٹر، B-50، سیکٹر 11/A، نارتھ کراچی (پاکستان)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فروغ نعت صبیح رحمانی کی زندگی کا واحد مشن ہے- وہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے اسی حوالے سے سوچتے رہتے ہیں- انھوں نے نعت گوئی اور نعت خوانی کے ساتھ ادبی افق پر نعت کی فنی اہمیت کو تسلیم کرانے اور اس پر عالمانہ و ناقدانہ بحث و نظر کے لیے نعت رنگ کا جو ادبی سلسلہ شروع کیا ہے وہ پابندی کے ساتھ جانب منزل گامزن ہے- اس وقت میرے سامنے نعت رنگ کا ۲۲واں تازہ شمارہ ہے- حسب سابق اس کا سرورق بہت ہی جاذب ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، مضامین و مقالات بھی فی الجملہ گزشتہ سلسلوں کے مطابق ہیں- کچھ جدت طرازیاں اور سحر نگاریاں بھی ہیں جن کا ذکر بطور خاص یہاں ضروری ہے-

صبیح رحمانی نے اس شمارے میں ایک جدت طرازی یہ کی ہے کہ اس بار سے ہر شمارے میں کسی مہمان مدیر سے ابتدائیہ لکھوانے کا آغاز کیا ہے- اس بار یہ قرعہ جناب ریاض مجید کے نام کا نکلا ہے- ریاض صاحب نے نعتیہ ادب پر تحقیقی ورک کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے راجہ رشید محمود کے ماہ نامہ ''نعت'' اور صبیح رحمانی کے ''نعت رنگ'' کی خدمات کا اعتراف کیا ہے- اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے اظہاریہ میں یہ بات بطور خاص کہی ہے کہ:

''محبت کے جذبے ازلی و ابدی ہوتے ہیں، غیر مبدل، مگر ان کا اظہار سچا تخلیقی تجربہ اور تازہ کاری چاہتا ہے-''

نعتیہ شاعری میں سہل نگاری، تقلید، مضامین کی یکسانیت اور جدت طرازی و تنوع سے گریزاں رویے کا چلن ہے جس سے ریاض مجید نعتیہ شعرا کو نکالنا چاہتے ہیں- جناب ریاض مجید کی اس بات کو پروفیسر عتیق اللہ صاحب (انڈیا) کی اس رائے سے جوڑ کر دیکھیے تو مطلب اور واضح ہوگا جس کا اظہار انہوں نے راقم کے ساتھ حالیہ ملاقات میں کیا کہ ''دراصل نعتیہ شاعری میں کوئی اتنا بڑا شاعر سامنے آیا ہی نہیں جو اہل ادب کو اپنی طرف متوجہ کرتا- جس طرح نظم کو اقبال نے اور آزاد نظم کو ن- م راشد نے اس عنبری پر پہنچا دیا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گئے-'' جناب پروفیسر عتیق اللہ کی رائے سے اتفاق اور عدم اتفاق سے قطع نظر، ان کے جذبے کی سچائی اور جناب ریاض مجید کے مشورے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا-

جناب صبیح رحمانی نے اپنے اداریے میں اپنے نعتیہ جذبات و واردات کے ساتھ جڑی شخصیات جنھوں نے اس بیچ اس دنیا کو خیر باد کہا ہے، کا ذکر خیر، محبت اور دور کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کیا ہے- یقیناً ان شخصیات کے اٹھ جانے سے محفل نعت سوگ وار ہے جس کا غم قارئین کو بھی ہوگا- ان شخصیات میں پروفیسر شفقت رضوی، ڈاکٹر عاصی کرنالی، نور احمد میرٹھی کی خبر رحلت سے ہمیں خاص طور سے افسوس ہوا- اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے-

''مقالات'' کے باب میں پہلی تحریر ڈاکٹر شعیب نگرامی کی ہے- موصوف کا تعلق سعودی عرب سے ہے- ''نعت رنگ'' کے صفحات پر تازہ وارد ہوئے ہیں- ان کی تحریر کو صبیح رحمانی نے اپنے قیمتی صفحات پر جگہ دی ہے، یہ بڑے حوصلے کی بات ہے- ہم اپنے حوصلے کو بھی سلام کرتے ہیں کہ ہم اس تحریر کو پڑھ سکنے میں کامیاب ہو گئے ورنہ ہماری عادت تو یہ ہے کہ ہم ایسی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہی صاحب تحریر کو سلام کر لیتے ہیں- اندازہ یہ ہوا کہ نگرامی صاحب ملامت نہیں، محبت بلکہ رحم کے مستحق ہیں- ہمیں شکوہ اس کا نہیں ہے کہ ان کی رائے ہمارے موقف کے سخت خلاف ہے یا یہ کہ انہوں نے بڑے بڑے اساطین امت کو جہنم کا راستہ دکھا دیا ہے- یہ فریضہ تو ان کے ہم خیال حضرات بجائے ایصال ثواب کرتے ہی رہتے ہیں- انہوں نے کچھ بھی نیا نہیں کیا ہے- انہوں نے نیا صرف یہ کیا ہے کہ بغیر حوالے اور دلائل کے بھی جس شان سے تکفیر کے فتاوے صادر کیے ہیں اس سے ان کی باطنی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے-

ہندوستان کے ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب کی تحریر مقالات کے باب میں دوسرے نمبر پر ہے، جو اس کا صحیح مقام ہے- یہ تحریر دراصل نعت رنگ شمارہ ۲۱ رمیں جناب رشید وارثی مرحوم کی تحریر ''اردو نعت میں

☆zishanmisbahi@gmail.com

ضمائر کا استعمال'' کا تنقیدی جائزہ ہے-ہمیں بعض دفعہ یہ دیکھ کر بڑی گھٹن ہوتی ہے کہ جہاں کوئی مسئلہ نہ ہو، ہمارے بعض اہل علم وہاں بھی مسئلہ پیدا کر لیتے ہیں اور اس پر تحقیقات کا ایسا دریا بہا دیتے ہیں کہ اس مسئلے کے سوا ساری چیزیں غرقاب ہو جاتی ہیں-سیدھی سادی بات ہے کہ ہر زبان کا اپنا اسلوب و انداز ہے- اردو کے جتنے بڑے ممتاز ادبا، شعرا اور اہل زبان ہوئے ہیں تقریباً سب کے یہاں کم از کم شاعری کی حد تک یہ اسلوب رائج اور مقبول ہے کہ وہ حمد و نعت میں اپنے ممدوح کے لیے تو، تیرا اور تم جیسے ضمائر پورے ادب اور ذوق وشوق کے ساتھ کرتے ہیں-اب بلاوجہ اس بحث کو طول دینا اور تحقیقات کے انبار لگانا میری سمجھ سے باہر ہے- اگر کچھ لوگوں کے پاس وقت زیادہ ہے تو اس کے لیے کوئی جائز مصرف کیوں نہیں تلاش کرتے؟ اگر شخصی طور پر یا کسی علاقے کی سطح پر کسی کو تم، تو اور تیرا میں تنقیص کا پہلو جھلک رہا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی یا علاقائی مسئلہ ہے- وہ اپنا فتویٰ اپنی ذات اور اپنے علاقے تک رکھے، پوری دنیائے اردو کو وہ اپنا ''ہم ذوق'' بنانے کے درپے کیوں ہے؟ ڈاکٹر اشفاق انجم بھارت کے کس کونے کے ہیں، مجھے نہیں معلوم، وہ جہاں کے بھی ہوں، اگر وہاں پر نعت اور حمد میں تو، تیرا اور تم کا استعمال ممنوع سمجھا جاتا ہو تو وہ نہ کریں، لیکن بالعموم پوری اردو دنیا میں بطور خاص شاعری میں تم، تیرا اور تو کا استعمال، غایت محبت اور وفور جذبات کے ساتھ رائج ہے- ایسے میں وہ پوری دنیا میں لٹھ لے کر نکلنے کی زحمت کیوں کر رہے ہیں؟ علم و تحقیق کے دوسرے بہت سے موضوعات خالی ہیں- کچھ اور بھی کر لیں- اب اشفاق صاحب کے ادب عالیہ، تحقیقات بدیعہ اور افکار بلند کی چند مثالیں بھی بلا تبصرہ دیکھ لیں-

''اردو میں ضمیر' آپ'' کے ہوتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''تو'' کے استعمال کو نا مناسب سمجھا گیا ہے-''

''ضمیر ''تو'' آج بھی محبوب کے لیے استعمال ضرور ہوتی ہے لیکن یہ محبوب غزل کا محبوب ہے-''

''جب خود اللہ تعالیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے نام کے بجائے یٰسین، طٰہٰ، مزمل تک جیسے القاب سے یاد کرتا ہے تو پھر ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ ہم آپ کا نام لے کر یا ''تو'' سے مخاطب کریں! اس لیے یہ تخاطب میرے نزدیک بے ادبی ہی نہیں بلکہ گستاخی ہے-''

اللہ کا شکر ہے کہ ایسے مفتیان کرام ایوان ادب میں بیٹھے ہیں- اگر ایوان شریعت ان کے حوالے کر دیا گیا تو پھر دین و شریعت کا اللہ ہی حافظ ہوگا-

''مقالات'' کے باب میں عزیز احسن کی تحریر ''نعتیہ شاعری میں نئی رشتوں کی تلاش'' اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کی تحریر ''دیار مغرب کے اردو شعرا کی نعتیہ شاعری'' بھی قابل قدر اور معلومات افزا ہیں-

''فکر و فن'' کے باب میں سید طاہر سیف الدین کے قیصدے فضیلۃ محمد رسول اللہ، مفتی احمد یار خاں نعیمی کی نعتیہ شاعری، ناز مانک پوری کے ارمغان عقیدت ''رہبر اعظم''، سید نظمی مارہروی کی نعت گوئی، صہبا اکبرآبادی کی نعت گوئی، ریاض حسین چودھری کی نعت گوئی، امان خاں دل کی نعتیہ شاعری اور ستیہ پال آنند کی ایک نعتیہ نظم پر بالترتیب ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر سراج احمد قادری، پروفیسر محمد اکرم رضا، غلام مصطفیٰ رضوی، عزیز احسن، ڈاکٹر افضال احمد نور، پروفیسر شفقت رضوی اور پروفیسر قیصر نجفی نے اپنے فکر و فن کے گہر لٹائے ہیں-

''نعت شناسی'' کا باب پچھلے شمارے میں قائم ہوا تھا جو اس شمارے میں بھی قائم ہے- اس باب میں ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر اسحٰق قریشی اور گوہر ملسیانی کی نعت شناسی پر بالترتیب پروفیسر محمد اکرم رضا، ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور پروفیسر اکرم رضا کی تحریریں شائع ہوئی ہیں- یہ سلسلہ نعتیہ محققین کی حوصلہ افزائی یا ان کی خدمات کے اعتراف کے حوالے سے بڑا اچھا ہے- بشرطیکہ یہ سلسلہ 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' کے مرض سے پاک رہے-

شمارے کے دیگر مشمولات بھی حسب روایت عمدہ ہیں- مولانا کوکب نورانی اس شمارے میں بھی نظر نہیں آئے- اللہ کریم کا شکر ہے کہ وہ مصروف ہیں- صبیح رحمانی کے لیے دل سے ڈھیر ساری دعائیں، نعتیہ محققین کو مبارک باد اور آخر میں ریاض مجید کا یہ شعر جو اس شمارے میں ایک جگہ نمایاں طور سے مکتوب ہے-

رسائی میں نہیں تخلیق نعت کا لمحہ
یہ سدرہ وہ ہے کہ جبریل لفظ تھک جائے

نعتیہ ادب پر ہندوستان میں بھی باضابطہ کام ہونا چاہیے، صبیح رحمانی کی یہ خواہش ہے جو ہماری بھی ہے- کاش کوئی صاحب ہندوستانی سطح پر اس علم کو بلند کریں، بشرطے کہ معیار، فن نعت کے شایاں ہو-

❑❑❑

دینی، ملی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

مدرسہ باغ عائشہ جمشید پور میں ''خواتین اسلام کانفرنس''

حسب سابق امسال بھی مدرسہ باغ عائشہ کے زیر اہتمام سالانہ ''خواتین اسلام کانفرنس'' اور طالبات کا تقریری، نعتیہ، اسلامی کوئز اور مہندی مسابقہ مورخہ ۱۱/جنوری ۲۰۱۲ء بروز بدھ عیدگاہ میدان آزادنگر، جمشید پور میں نہایت تزک واحتشام کے ساتھ انعقاد کیا گیا، جس میں ملک وبیرون کے عالمات وفاضلات اوردانشورانِ خواتین نے شرکت فرما کر ہزاروں کی تعداد میں شریک خواتین اسلام سے خطاب فرمایا-

آزادنگر کے وسیع وعریض میدان میں خواتین کے لیے پردے کے ساتھ بیٹھنے کا اہتمام کیا گیا تھا، جس میں ایک اندازے کے مطابق پانچ ہزار سے زیادہ خواتین اسلام نے شرکت کر کے اپنے مذہب اسلام سے وابستگی کا اظہار کیا- کانفرنس کا آغاز تلاوت کلام اللہ سے ہوا- پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر محترمہ عالمہ وفاضلہ فرحانہ قادری (حاجی علی ممبئی) نے شرکت کی اور محترمہ رضیہ بانو کے زیرِ صدارت پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچا- ان کے علاوہ باہر سے تشریف لانے والے نعت خوانانِ مصطفےٰ ﷺ میں محترمہ دیبہ عرشی، سامعہ فردوس، اسری عبید وہمنوا (حیدرآباد) اور غلال محمد عامری نے بارگاہِ رسالت میں نعتیہ کلام پیش کیا- اس موقع سے حکومت جھارکھنڈ کے وزیر اعلیٰ جناب ارجن منڈا کی اہلیہ محترمہ میرا منڈا بھی آئیں- انہوں نے پروگرام کو دیکھ کر باغِ عائشہ کی چیئر پرسن محترمہ زیبا قادری بنت علامہ ارشد القادرری کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ میں عورتوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ہر طرح کی امداد کی کوشش کرونگی- ساتھ ہی تقریری، نعتیہ، اسلامی کوئز اور مہندی مسابقہ میں اول، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والی طالبات کو محترمہ میرا منڈا کے ہاتھوں سے انعامات دیا گیا-

لندن سے تشریف لائے علامہ قمرالزماں خان اعظمی صاحب (صدر ورلڈ اسلامک مشن لندن) نے بذریعے ٹیلی فون خطاب فرمایا- انہوں نے کہا کہ خواتین اسلام کو عصری علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم سے بھی آراستہ ہونا بہت ضروری ہے- ساتھ ہی محترمہ زیبا قادری کو مبارک باد پیش کی اور باغ عائشہ کی ترقی وکامیابی کے لیے دعا فرمائی- عالمہ وفاضلہ محترمہ فرحانہ قادری نے اپنی تقریر میں تعلیم نسواں کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی- شہر جمشید پور کے M.L.A مسٹر بنّا گپتا نے بھی ٹیلی فون پر خطاب کیا اور کہا کہ میں ہر طرح سے باغ عائشہ کی مدد کروں گا- فی الحال انہوں نے مدرسہ باغ عائشہ کو ۵/عدد کمپیوٹر دینے کا وعدہ کیا ہے- ساتھ ہی ریاست جھارکھنڈ، بہار اور چھتیس گڑھ کی H.R محترمہ لالوت (C.B.S.C بورڈ) نے بھی شرکت کی انہوں نے بھی مبارک باد پیش کرتے ہوئے آئندہ تعاون کا وعدہ کیا-

آخر میں باغِ عائشہ کی چیئر پرسن محترمہ زیبا قادری بنت علامہ ارشد القادری نے خطبہ استقبالیہ دیا- انہوں نے کہا کہ ''مجھے بہت مسرت ہورہی ہے کہ میں آپ لوگوں کے روبرو ''خواتین اسلام کانفرنس'' میں کچھ بولنے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں، بفضلِ خدا مدرسہ باغ عائشہ کی بنیاد فروری ۲۰۰۲ء میں رکھی گئی جس میں مسلم بچیوں کو سلائی، کڑھائی، بنائی کے ساتھ مفت میں دینی وعصری علوم سے آراستہ کیا جاتا ہے- الحمدللہ! باغ عائشہ کی جانب سے غریب ویتیم لڑکی کی شادی اور علاج مفت میں کرایا جاتا ہے- فی الوقت مدرسہ باغ عائشہ میں ۵/اساتذہ اور ۱۵۰/مقامی وبیرونی طالبات زیر تعلیم ہیں جو اردو، عربی کے ساتھ سلائی، کڑھائی، بنائی میں بھی مہارت حاصل کر رہی ہیں-'' مزید انہوں نے کہا کہ بفضلِ الٰہی مدرسہ باغ عائشہ کے لیے ۱۰/کٹھا زمین کا سودا ہو چکا ہے جس کی قیمت ۲۰/لاکھ روپے ہے- ایک اسکوائر فٹ کی قیمت ۳۵۰/روپے ہے، جس میں گرلس ہوسٹل، لائبری اور دینی درس گاہ بنانے کا منصوبہ ہے، جس میں درسِ نظامیہ، حفظ، قرأت وغیرہ کی پڑھائی ہوگی-'' آخر میں موصوفہ نے لندن سے تشریف لانے والے علامہ ڈاکٹر قمرالزماں خان اعظمی صاحب، تمام سامعین، اخباری نمائندوں، اساتذہ، معاونین ومخلصین بھائیوں اور بہنوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور قوم

وملت سے ہمدردی رکھنے والے بھائیوں اور بہنوں سے پرخلوص تعاون کی اپیل کی-اس کے بعد جانشین قائد اہل سنت ڈاکٹر غلام زرقانی نے بھی بذریعے ٹیلی فون مجمع سے خطاب فرمایا اور امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے دعا فرمائی اور فاتحہ صلوۃ وسلام اور ڈاکٹر غلام زرقانی کی دعا پر پروگرام اختتام پذیر ہوا-

رپورٹ: ——— احمد رضا، مدرسہ باغ عائشہ، جمشید پور (جھارکھنڈ)

نوری مشن ورضا اکیڈمی کی جانب سے ۱۲/ربیع الاول کو مریضوں کی عیادت اور لٹریچر کی تقسیم

انسانیت کی خدمت وہ عمل ہے جس کی تعلیم رحمت عالم ﷺ نے دی- اسی مبارک جذبے کے ساتھ نوری مشن کے طلبہ اور رضا اکیڈمی نے ۱۲/ربیع النور کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی مناسبت سے بعد فجر شہر کے ۱۲/اسپتالوں کو دورہ کر کے مریضوں میں پھلوں کی تقسیم کی اور اسی کے ساتھ ہندی اور اردو میں لٹریچر تقسیم کیے- اس موقع پر سول اسپتال میں وزٹ کے دوران شہر ایس پی نے بھی حاضری لگائی اور کہا کہ ایسے کام انجام دے کر نوری مشن اور رضا اکیڈمی نے پیغمبر اسلام ﷺ کی یاد تازہ کی ہے- یہ انسانیت نوازی کی مثال ہے- جب کہ ڈاکٹر سنیت شاہ اور ڈاکٹر سنجے شاہ نے کہا کہ ایسے خوشی کے موقع پر مریضوں کا سنی کمیونٹی کی طرف سے خیال رکھا جانا بڑا نیک اور منفرد کام ہے-

اس دورے کی قیادت محمد میاں مالیگ، ڈاکٹر رئیس احمد رضوی، حافظ شکیل احمد رضوی، شکیل احمد سبحانی اور غلام مصطفیٰ رضوی نے کی جب کہ وفد میں محمد جاوید رضوی، عامر رضا، وسیم احمد رضوی، محمد سعید رضا، عتیق الرحمٰن رضوی، محمد سبطین رضا، محمد ثقلین رضوی، رضوی سلیم شہزاد، محمد ابراہیم رضوی، محمد عتیق احمد، معین رضوی، جنید رضا، فرید رضوی شامل تھے- وفد نے سول ہاسپٹل، ویدیہ ہاسپٹل، واڈیا ہاسپٹل، علی اکبر ہاس پٹل، نیا فاران ہاسپٹل، جونا فاران، نور ہاسپٹل، الرضا ہاسپٹل، میڈی کیئر ہاسپٹل، منصورہ ہاسپٹل وغیرہ کا دورہ کیا، مریضوں کی عیادت کی، محمد میاں مالیگ نے کہا کہ 'اسلام کے تعارف میں ہندی اور اردو میں لٹریچر کی تقسیم دراصل اشاعت اسلام کا حصہ ہے-' اسی طرح طلبہ اور غربا میں بھی پھلوں کے پیکٹ تقسیم کیے گئے-

رپورٹ: ——— نوری مشن، مالیگاؤں، ضلع ناسک (مہاراشٹر)

جامعہ برکاتیہ حضرت صوفی نظام الدین سنت کبیر نگر میں طلبہ کا مسابقہ

دارالقلم کے زیراہتمام تحریری انعامی مقابلے کا پروگرام جامعہ برکاتیہ حضرت صوفی نظام الدین محلّہ نظام آباد لہرولی بازار ضلع سنت کبیر نگر کے محدث امروہوی ہال میں منعقد ہوا، جس کی سرپرستی خطیب البراہین مولانا صوفی محمد نظام الدین رضوی صاحب اور صدارت شہزادۂ خطیب البراہین مولانا محمد حبیب الرحمٰن رضوی سربراہ اعلیٰ جامعہ برکاتیہ نے کی، جبکہ نظامت مولانا محمد طاہر القادری مصباحی نے کی، پروگرام کا آغاز مولانا محمد سعید نظامی کے تلاوت کلام پاک سے ہوا، پروگرام میں مختلف مدارس وجامعات کے طلبہ نے شرکت کی جس میں گروپ (الف) و (ب) میں اول، دوم، سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو اعزازی جبکہ باقی طلبہ کو ترغیبی انعامات مفتی محمد قدرت اللہ رضوی شیخ الحدیث دارالعلوم اہل سنت تنویر الاسلام امرڈوبھا نے اپنے ہاتھوں سے دیا-

اس پروگرام میں طلبہ کو مقالہ نویسی کے طریقے اور اس کے فوائد پر علمائے کرام نے مکمل طور پر روشنی ڈالی، مولانا محمد حبیب الرحمٰن رضوی، مفتی محمد قدرت اللہ رضوی صاحب، پیامی نظامی کے چیف ایڈیٹر مولانا محمد محسن نظامی اور جامعہ رابعہ بصریہ نسواں کے شیخ الحدیث مولانا تفسیر القادری نے طلبہ سے خطاب فرمایا اور انھیں نصیحت آمیز باتیں سمجھائیں-

اخیر میں شریک طلبہ کے گروپ (الف) میں محمد کیف ثالثہ متعلم جامعہ ہٰذا، صدام حسین اعدادیہ متعلم جامعہ ہٰذا، ریاض الدین ثانیہ دارالعلوم غوثیہ رضویہ اگیا کو بالترتیب اول، دوم، سوم انعام دیا گیا - یوں گروپ (ب) میں محمد نعمت اللہ برکاتی سادسہ متعلم دارالعلوم غوثیہ رضویہ اگیا، عابد علی نظامی سابعہ متعلم دارالعلوم اہل سنت تنویر الاسلام امرڈوبھا، عبدالقیوم نظامی سادسہ دارالعلوم غوثیہ رضویہ اگیا کو بالترتیب اول، دوم، سوم اعزازی انعام بطور کتاب دیا گیا- باقی تمام طلبہ کو ترغیبی انعام دیا گیا- اس پروگرام میں مولانا حیدر علی اشرفی صدرالمدرسین دارالعلوم اہل سنت رضویہ دساواں، مولانا عظیم الدین دساواں، مولانا محبّ الرحمٰن مصباحی، مولانا سید علی نظامی صدرالمدرسین الجامعۃ العربیہ سعید العلوم لچھمی پور، قاری محمد غیاث الدین خان نوری ناظم اعلیٰ ثناء اللہ ایجوکیشن اینڈ ٹیکنکل گرلس کالج مڑلا حسن پور نوتنواں مہراج گنج، مولانا آفتاب احمد اگیا، مولانا اکبر علی مہدیوا، مولانا صغیر احمد نظامی حسنی، مولانا سید علی نظامی ناظم اعلیٰ جامعہ نظامیہ عزیز البنات للائن پیسیا مہراج گنج،

مولانا تبارک حسین قادری لہرولی، جمال حیدر خان مڑلا حسن پور و دیگر علمائے کرام وحفاظ کرام اور جامعہ کے تمامی اساتذہ نے شرکت کی- اخیر میں پروگرام کے کنوینر نبیرۂ خطیب البراہین مولانا ضیاء المصطفیٰ نظامی صدرالمدرسین جامعہ ہٰذا نے تمامی شرکا کا شکریہ ادا کیا-

رپورٹ:——جامعہ برکاتیہ حضرت نظام الدین، لہرولی بازار سنت کبیرنگر

سیرت مبارکہ پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ: امین ملت

جامعۃ البرکات علی گڑھ میں جشن آمد رسول

جشن ولادت باسعادت سرور کائنات ﷺ کے سلسلے میں جامعہ البرکات علی گڑھ میں مؤرخہ ۱۰ ربیع الاول شریف بعد عشا عظیم الشان جشن عید میلاد النبی منعقد کیا گیا، جس کی صدارت وسرپرستی حضور امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی نے فرمائی، قاری سید نور عالم نے تلاوت فرقان حمید سے جلسے کا آغاز کیا، جامعہ البرکات کے طلبہ محمد عدنان اور عظمت برکاتی نے بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت پیش کیا، ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی (جوائنٹ سکریٹری البرکات) نے نظامت کے فرائض انجام دیے، انہوں نے کہا کہ ''جامعہ البرکات ہر سال ماہ ربیع النور میں سیرت تقریبات منعقد کرتا ہے، اس سال بھی یہ تقریبات پورے خلوص اور تزک واحتشام سے منعقد کی گئیں، جامعہ کے زیر اہتمام آل اسکولز سیرت مقابلے منعقد کیے گئے، جس میں علی گڑھ کے ۲۵ر اسکول اور ۵ر مدارس اسلامیہ کے ۲۰۰ر طلبہ نے حصہ لیا، ان مقابلوں میں مقابلہ قرات، مقابلہ نعت خوانی، مقابلہ تقریر اور مقابلہ مضمون نگاری شامل ہیں، کامیاب طلبہ اور طالبات کو حضور امین ملت کے دست مبارک سے انعامات سے نوازا گیا-''

جلسے کے مقرر خصوصی صاحبزادہ مولانا عطیف میاں قادری بدایونی نے سیرت مبارکہ پر پرمغز اور ولولہ انگیز تقریر کی، ان کی تقریر سے عوام اور اہل علم ودانش یکساں طور پر مستفیض ومتأثر ہوئے-

آخر میں صدر اجلاس حضرت امین ملت نے خطبہ صدارت پیش فرمایا، آپ نے سیرت مبارکہ کے ان گوشوں پر خصوصیت سے روشنی ڈالی جن میں انسانیت کو حصول علم کی راہ دکھائی گئی ہے، آپ نے مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی حالت کا بنیادی سبب یہ بتایا کہ ہم اپنے رسول کی سیرت اور ان کی تعلیمات سے دور ہو گئے، اسی لیے علم وتعلیم کے میدان میں بھی پچھڑ گئے- آپ نے اس ماہ مبارک میں خوشی ومسرت کے اظہار اور عشق ومحبت کے مظاہرے کے ساتھ جذبہ اتباع اور ذوق اطاعت بھی پیدا کرنے پر زور دیا- آخر میں صلاۃ وسلام اور صاحب صدر کی دعا پر یہ مبارک اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا-

رپورٹ:——نعمان احمد ازہری، جامعۃ البرکات، علی گڑھ

برطانیہ میں ''نعت ریسرچ سینٹر'' کے قیام کا منصوبہ

''برطانیہ میں نعت گوئی اور نعت خوانی کے فروغ کے لیے ''نعت ریسرچ سینٹر'' کا قیام عمل میں لائے جایا گا چونکہ یہاں اچھی نعت لکھنے اور پڑھنے والوں کی کوئی کمی نہیں- یہ ادارہ نعتیہ شاعروں اور نعت خوانوں کے ذوق وشوق کو اسلام کی روح کے مطابق پروان چڑھانے کا باعث بنے گا-'' ان خیالات کا اظہار نعت رنگ اور نعت ریسرچ سینٹر پاکستان کے سرپرست و بانی نعتیہ شاعر اور معروف نعت خواں صبیح الدین صبیح رحمانی نے حافظ داؤد پٹیل کی رہائش گاہ پر اپنے اعزاز میں منعقد استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کیا- واضح رہے کہ صبیح رحمانی فروری ۲۰۱۲ء میں نعتیہ پروگرامز کے سلسلے میں برطانیہ کے مختلف شہروں میں تھے-

انہوں نے کہا کہ ''نعت کو آج کے دور میں صرف سماع تک محدود کر دیا گیا جس کے باعث نعتیہ شاعری تاریخ کا حصہ نہ بن پائی- ہمارے ادارہ نے مختلف اسلامی مکاتب فکر کے اسکالروں کی مدد اور کئی کٹھن مراحل سے گزر کر نعت پر تنقید کو پہلی بار مستقل حیثیت دلائی اور نعت کے ادبی پہلوؤں کو مستقل میدان بنا دیا-'' انہوں نے کہا کہ تاریخ کا اصول ہے کہ کوئی بھی ادب اس وقت تک تاریخ کا حصہ نہیں بن سکتا جب تک وہ تنقید کی کسوٹی سے نہ گزر جائے- انہوں نے کہا کہ نعت کی جہاں اسلامی اور ثقافتی قدریں ہیں وہیں نعت کے سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کی اہمیت کو بھی ذہنوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے- سید صبیح الدین صبیح رحمانی نے کہا کہ خانہ کعبہ کے بعد برطانیہ وہ جگہ ہے جہاں سے اسلام کی نشاط ثانیہ کا انقلابی کام ہو سکتا ہے- برطانیہ میں نعت سینٹر کا قیام جہاں نعت لکھنے اور پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا وہی مختلف تحقیقی اداروں کے ساتھ رابطہ کے ذریعے مدحت رسول ﷺ کی علمی وادبی روایت اور اس کی افادیت کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کراتے ہوئے نعت گوئی پر تحقیق کے کام کو بھی سرانجام دے گا-

رپورٹ:——شفقت مرزا/ نمائندہ جنگ، شفیلڈ (انگلینڈ)

داعی اسلام عارف باللہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی

کی قلبی واردات، گنجینۂ معانی، بحر حقائق ومعارف، مثنوی

نغمات الاسرار فی مقامات الابرار

جو سلیس اردو زبان میں شریعت وطریقت کا انمول خزانہ اور طالبین معرفت وحقیقت کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے-

تیسرا ایڈیشن

اپنے نئے رنگ وآہنگ اور مولانا ذیشان احمد مصباحی کے قلم سے ضروری توضیحی حواشی کے ساتھ منظر عام پر آچکا ہے-

زیرِ اہتمام: شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ/جامعہ عارفیہ سید سراواں، کوشامبی، الہ آباد

داعی اسلام عارف باللہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کے زیر سرپرستی شائع ہو چکا ہے

تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مجلّہ

کتابی سلسلہ **الاحسان** الہ آباد

مدیر: حسن سعید صفوی

مرتبین

مجیب الرحمٰن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمٰن علیمی، رفعت رضا نوری

تیسرا شمارہ منظر عام پر آگیاہے - اہم جھلکیاں

○ تصوف اور صوفیہ- علامہ ابن حجر ہیتمی کی نظر میں ○ بیعت واجازت- احادیث کی روشنی میں ○ حضرت جنید بغدادی: علمی تبحر، روحانی مشاغل ○ حضرت سید بہاء الدین بنگلوری ○ صوفی خواتین- ایک جائزہ ○ حافظ ابن قیم جوزی اور ان کا ذوق تصوف ○ الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ- ایک تجزیاتی مطالعہ ○ غزالی اور مسئلۂ تکفیر- ایک جائزہ ○ حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں پر خصوصی گوشہ ○ خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور کی تاریخ اور کارناموں پر خصوصی تحریر اور صاحب سجادہ مفتی عبید الرحمٰن رشیدی کا تفصیلی انٹرویو ○ عصر حاضر میں احیاے تصوف کا کام کن اصولوں کے تحت ممکن ہے؟ پر خصوصی بحث، وغیرہ

ناشر: **شاہ صفی اکیڈمی**، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

shahsafiacademy@gmail.com / **E-mail** :alehsaan.yearly@gmail.com